# مثنوی لطف



موسوم بہ

مرزا علی لطف

# نیرنگِ عشق

مرتبہ

ڈاکٹر ثمینہ شوکت ام۔اے، پی۔ایچ۔ڈی
لکچرار اردو - زنانہ کالج
عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد دکن

ناشر

مجلس تحقیقاتِ اردو، حیدرآباد دکن

۱۹۶۲ء

ملنے کے پتے

• دفتر مجلس تحقیقاتِ اُردو
۶۸۸-۶-۳، حمایت نگر، حیدرآباد دکن

• نیشنل بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد دکن

قیمت :- دو روپے پچاس نئے پیسے

(مطبوعہ)
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
(دکن)

# انتساب

قبلۂ جاں و کعبۂ دِل والدِ محترم حضرت

سیّد منہاج الدین شوکت

کے

ن کے فیضانِ تربیت نے مجھے شعورِ زندگی

اور

ذوقِ ادب بخشا

ثمینہ

# فہرست مشتملات

ڈاین ڈبلن گجو ہا نہ اُسکی کتابہ زہ

# پیش لفظ

INTRODUCTION

مرزا علی لطفؔ، اُردو کے مشہور انشاء پرداز اور شاعر ہیں۔ ان کے تذکرہ "گلشن ہند" کی بدولت ان کا نام اُردو ادیبوں کی فہرست میں بہت اونچا ہو گیا ہے، لیکن اُن کے اور ان کی تصانیف کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی جزوی تھیں۔ ان کی مثنوی اور ان کا دیوان ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔ دیوان لطف کے غالباً ایک یا دو ہی نسخے اب محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان کی مثنوی کے بارے میں کچھ معین معلومات ہماری دسترس میں نہیں تھیں، صرف ایک دو قدیم تذکروں میں حوالے ملتے تھے۔ اتفاق سے ان کی مثنوی کا ایک نسخہ مجھے کتب خانہ مجلس تحقیقات اردو میں دستیاب ہو گیا۔ مجلس تحقیقات کے ارکان میں، مجھے اس کا علم تھا کہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں لطفؔ سے متعلق کافی نیا مواد اکٹھا کر لیا ہے اور انہیں ان کے حالات اور کارناموں کی مزید ٹوہ ہے۔ اس لئے میں نے ان سے خواہش کی کہ مثنوی لطفؔ کو مجلس تحقیقات کے لئے مرتب کر دیں۔ تلاش سے کتب خانہ آصفیہ میں مثنوی کا ایک نسخہ جو غلط نام سے رائج تھا مل گیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر گیان چند صاحب نے جنہوں نے شمالی ہند کی اردو مثنویوں پر تحقیق کی ہے، رامپور اور علی گڑھ کے نسخوں کا پتہ دیا۔ ان کی نقلیں بھی حاصل کی گئیں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے بڑی محنت اور ذوق کے ساتھ مثنوی کے سارے نسخوں کا مقابلہ کر کے ایک مستند متن تیار کر لیا۔ اس کے مقدمہ کے سلسلے میں انھوں نے لطفؔ کے سوانح حیات قلمبند کر کے جب مجھے دیکھنے کے لئے دیئے تو یہ اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر موصوفہ نے لطفؔ کی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں بڑی کھوج

کر کے سارے ماخذوں سے معلومات اکٹھا کر دی ہیں اور کوئی ایک سو صفحوں کی مستند سوانح مرتب کر لی ہے۔ پھر ان کے بحث و تمحیص کا انداز عالمانہ اور استنباط نتائج کا اسلوب منطقی اور جدید تحقیق کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

اس سارے کام کو دیکھ کر میری یہ خواہش ہوئی کہ لطف کا دیوان بھی وہ مرتب کر دیں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اس کام کو بھی اپنے ذمہ لے لیا اور نہایت تن دہی اور ذوق کے ساتھ مخطوطے کے مبہم اشعار کی چھان بین کر کے ان کی تصحیح کی اور دوسرے ماخذوں سے بھی کلام اکٹھا کر دیا اور جہاں جہاں لطف کا کلام مل سکا، اس سے دیوان کا مقابلہ کر کے ایسے اشعار کا حوالہ بھی دے دیا ہے جو اور تصانیف میں ملے۔

اس تلاش و تحقیق کے نتیجے کے طور پر جو کام اب منظرِ عام پر آ رہا ہے وہ حتی الامکان مکمل ہے اور اردو ادب اور تاریخ ادب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجلسِ تحقیقات نے مثنوی کے علاوہ 'دیوانِ لطف' کو بھی علیحدہ شائع کیا ہے اور سارے کلام اور حیات کو اکٹھا کلیات کی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے۔

---

۶۸۸-۶-۳ حمایت نگر حیدرآباد دکن
۱۰-۱-۶۲ء

عبدالقادر سروری
صدر شعبہ اردو
جموں و کشمیر یونیورسٹی
سری نگر

# مصنّف اور کارنامہ

## (۱) مصنّف

مرزا علی لطف اُردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ شاعر ہیں۔ لیکن ان کی شہرت زیادہ تر ان کے تذکرہ "گلشن ہند" کی وجہ سے ہوئی "گلشن ہند" کی اہمیت سوانحی، ادبی اور سب سے بڑھ کر تاریخی ہے۔ لطف نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی چھوڑا ہے جس میں اپنے زمانے اور ہر زمانے کے ذوق کے اتباع میں انھوں نے غزل پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ دوسری اصناف میں مثنوی سے انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ لیکن ان کی مثنوی اب تک عام نظروں سے اوجھل رہی، اس لئے بہ حیثیت مثنوی نگار کے ان کا حقیقی پایہ ہمارے پیش نظر نہیں تھا۔

لطف بارہویں صدی ہجری کے ربع آخر کی اہم ادبی شخصیتوں میں سے ہیں اور ایک خاص بات ان کے بارے میں یہ قابل ذکر ہے کہ وہ دو عہدوں کے ملاپ کی پیداوار ہیں، ایک ماضی جو اپنے سارے جاگیردارانہ تصورات اور ادبی ذوق کے ساتھ اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا، دوسرا ایک عہد نو جو نئے سرمایہ دارانہ اور صنعتی شعور کو لئے ہوئے اُبھر رہا تھا۔ لیکن نئے عہد کا شعور لطف کی شاعری میں

اتنا نمایاں نہیں ہو سکا جتنا ان کے نثری کارنامے میں۔

ہمارے تذکرہ نگاروں نے، نثر نگاروں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی اور شعرا پر ان کی تمام تر ہمتیں صرف ہوئیں۔ پھر بھی لطف کا ذکر ان کے زمانے اور بعد کے سارے تذکروں میں مل جاتا ہے۔ خود انھوں نے بھی اپنے تذکرے میں کچھ حالات لکھے ہیں۔ لیکن بقول مولوی عبدالحق مرحوم کے "یہ حالات "برائے نام" ہیں۔ پھر بھی یہ اجمال ان کے حالات کے سلسلے میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

**آبا و اجداد** لطف نے "تذکرہ گلشن ہند" میں اپنے اجداد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ صرف اپنے والد مرزا کاظم بیگ کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل دی ہے۔ ان کے اجداد استرآباد کے رہنے والے تھے۔ خود لطف کے بیان کے مطابق، مرزا کاظم بیگ نادر شاہ کی افواج کے ہمراہ ۱۱۵۴ھ میں، شاہ جہاں آباد آئے لیکن جب نادر شاہ ہندستان سے ایران لوٹے تو مرزا ان کے ساتھ واپس وطن نہیں گئے بلکہ یہیں رہ گئے۔ اس کا باعث یہ تھا کہ ان کے ہم وطن ابوالمنصور خاں صفدر جنگ جن سے لطف کے والد کے دیرینہ مراسم تھے ان سے پہلے دہلی آگئے تھے، اور محمد شاہ کے دربار میں بڑا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ مرزا کاظم بیگ بھی انھیں کی وساطت سے محمد شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے، اور شاہی عنایات سے سرفراز کیے گئے۔

مرزا کاظم بیگ فارسی کے اچھے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے

علی لطف نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ انھیں "غزلِ فارسی کے کہنے میں یدطولیٰ حاصل تھا"[1] اس سے زیادہ انھوں نے کچھ نہیں لکھا، اور اشعار بھی اس لئے نقل نہیں کر سکے کہ یہ تذکرہ شعرائے اردو کا تھا۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے کلام کا کوئی مجموعہ بھی چھوڑا تھا یا نہیں۔

مرزا کاظم بیگ کا انتقال کب ہوا، اس کا ہم کو علم نہیں ہے۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ آصف الدولہ کے عہد میں عرصہ تک لکھنؤ میں رہے چنانچہ شاہ کمال، مرتب تذکرہ "مجمع الانتخاب" نے اپنے قیام لکھنؤ کے زمانے (۱۱۹۰ھ تا ۱۲۱۴ھ) میں ان سے ملاقات کی تھی[2]۔

**حالات** لطف کا پورا نام مرزا علی تھا[3]، اور کچھ تذکرہ نگاروں نے مرزا علی خاں بھی لکھا ہے[4]۔ لیکن قطب الدین باطن نے پتہ نہیں کس بنا پر ان کا نام مرزا غالی[5] بتایا ہے۔ خود لطف نے "گلشن ہند" میں اپنا نام مرزا علی ہی لکھا ہے۔ ان کے ایک معاصر شاعر شیخ حفیظ

---

۱؎ گلشن ہند ص ۴۷-۱۴۶۔

۲؎ ملاحظہ ہو مخطوطہ "مجمع الانتخاب" کتب خانہ سالار جنگ ورق ۶۷۹ ا

۳؎ ملاحظہ ہو "مجموعہ نغز" ج ۲ ص ۱۴۸، گلشن بے خار ص ۱۶۷ نیز تاریخ گلزار آصفیہ ص ۲۵۰

۴؎ مجمع الانتخاب ورق ۶۷۹ ب نیز خطیات کارساں دتاسی ص ۸۳

۵؎ نغمہ عندلیب ص ۲۰۲۔

حفیظ دہلوی نے بھی یہی نام لکھا ہے۔ حفیظ، مہاراجہ چندو لال شاداں،
دیوان حیدرآباد کے استاد تھے، اور عرصہ تک حیدرآباد میں مقیم رہے تھے۔
مرزا علی لطف سے ان کی ملاقات حیدرآباد ہی میں ہوئی تھی۔ حفیظ کا شعر ہے:

حفیظ الطاف ہے مرزا علی لطف کا مجھ پر
سبب یہ ہے کہ بندہ ہوں جناب شاہ مرداں کا

**ولادت** علی لطف کے سنہ ولادت کا پتہ نہیں چلتا، لیکن کچھ واقعاتی شہادتوں سے مدد لے کر ہم ایک تخمینی سنہ معلوم کر سکتے ہیں۔ لطف نے گلشن ہند میں آصف الدولہ کا حال لکھتے ہوئے اپنے بارے میں یہ تفصیل دی ہے کہ:—

"راقم آثم صغر سن سے ملازموں میں اس آستانہ دولت کے معہ رسالہ سرفراز تھا۔"[1]

یہ ملازمت یقیناً آصف الدولہ کی تخت نشینی کے بعد کا واقعہ ہے۔ آصف الدولہ ۱۱۸۷ھ میں تخت نشیں ہوئے۔ اس وقت لطف کی کم عمری تھی۔ شوق نے اپنے تذکرہ میں جو ۱۱۹۸ھ کی تصنیف ہے لطف کا حال لکھا ہے، اور ان کی مثنوی کا بھی ذکر کیا ہے[2]۔ اس لحاظ سے اگر اس تصنیف کے زمانے میں ان کی عمر کم سے کم انیس بیس برس فرض کی جائے تو ان کا سنہ ولادت ۱۱۶۸ھ کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔

---

[1] گلشن ہند، ص ۱۴۔ [2] مخطوطہ طبقات الشعرا، ورق ۱۳۹ الف/ب، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن

شاہ کمال اور مصحفی کے بیانات سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ کمال ۱۱۹۰ھ کے قریب جب لکھنؤ آئے تو انھوں نے لطف سے ملاقات کی تھی یہ لطف کی جوانی کا زمانہ تھا۔ چنانچہ لطف کے حالات لکھتے ہوئے وہ انھیں "جوان خوش فکر" بتاتے ہیں۔ اس بات پر مزید روشنی مصحفی کے بیان سے بھی پڑتی ہے۔ ۱۲۰۱ھ میں جب مصحفی لکھنؤ آئے اور لطف کو دیکھا تھا تو وہ جوان تھے۔ چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں:

"جوان خوش فکر دیدمش"[1]

"تذکرہ ہندی" ۱۲۰۹ھ کا مرتبہ ہے۔ اس کے سنہ تالیف کے پیش نظر یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ مصحفی نے تذکرہ کی ترتیب کے وقت انھیں جوان دیکھا تھا حالانکہ یہ بات نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مصحفی کے بیان کا تعلق ان کے لکھنؤ آنے کے زمانے سے ہے۔ مصحفی کے لکھنؤ آنے کا سنہ کسی تاریخ یا تذکرہ میں درج نہیں ہے لیکن علی لطف کے بیان سے ہم کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ مصحفی "گلشن ہند" کی ترتیب سے چودہ برس پہلے لکھنؤ آئے۔ چنانچہ مصحفی کے حالات میں لطف لکھتے ہیں:

"بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ ہیں، ایک چودہ برس سے اوقات
لکھنؤ میں بسر کرتا ہے"[2]

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۲۰۱
[2] گلشن ہند ص ۱۶۶

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہے کہ مصحفی ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ آئے تھے اور علی لطف کو انھوں نے اس زمانے میں نوعمر دیکھا تھا۔ اس وقت لطف کی عمر کا اندازہ، شاہ کمال اور مصحفی کے بیانات کا لحاظ کرتے ہوئے بتیس تینتیس برس ہوتا ہے۔

لطف کی ولادت دہلی میں ہوئی تھی۔ ان کی عمر کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں بسر ہوا اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت بھی ہوئی تھی۔ چنانچہ شیفتہ لکھتے ہیں:

"در دہلی نشو و نما یافتہ"[1]

عبدالغفور خاں نساخ کا بیان بھی یہی ہے کہ علی لطف نے "دہلی میں تربیت پائی تھی"[2]۔ ظاہر ہے کہ ان مجمل اشاروں سے لطف کی تعلیم و تربیت کے بارے میں شمالی ہند کے تذکروں سے، ہم کو کوئی معلومات نہیں ہوتیں۔ لیکن ان کے ایک دکنی معاصر مورخ غلام حسین خاں جوہر مصنف "گلزار آصفیہ" کے بیان سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ لطف نے عربی، فارسی اور اردو میں اچھی دستگاہ پیدا کرلی تھی۔ جوہر لکھتے ہیں:

"صاحب استعداد عربی، فارسی و ہندی"[3]

---

[1] گلشن بے خار ص ۱۶۷

[2] سخن شعرا ص ۴۰۵

[3] گلزار آصفیہ ص ۵۴

لطف کی عمر کے ابتدائی سترہ اٹھارہ برس دہلی میں بسر ہوئے اور ان کی فارسی شاعری کا آغاز بھی دہلی میں قیام کے زمانے ہی میں ہوا۔ خود ان کے بیان کے مطابق فارسی شاعری میں وہ اپنے والد کے شاگرد تھے۔ لکھتے ہیں:

"اصلاح فارسی کی اس ہیچ مداں کو آپ ہی کی جناب سے ہے"۔[1]

اعظم الدولہ سرور نے لطف کو شیخ شرف الدین شاہ ملول کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن یہ صراحت نہیں کی کہ یہ تلمذ فارسی میں تھا یا اردو میں۔ خود لطف نے "گلشن ہند" میں شاہ ملول کے جو حالات لکھے ہیں ان میں ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ شاہ ملول لکھنؤ کے شیخ زادوں میں سے تھے۔ لطف نے ان کی درویش منشی کی تعریف کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اہل لکھنؤ کو شاگردی کے علاوہ ان سے عقیدت بھی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ خود لطف کو بھی ان سے عقیدت رہی ہو، اور اسی بنا پر سرور نے انھیں ملول کا شاگرد لکھ دیا ہو۔

شاہ ملول فارسی کے شاعر تھے۔ لیکن کبھی کبھی اردو میں بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے بعد میں الہام تخلص اختیار کیا تھا۔ چنانچہ لطف نے ان کے حالات اسی تخلص کے تحت درج کئے ہیں۔[2]

---

[1] گلشن ہند ص ۱۴۷۔

[2] ایضاً ص ۲۹۔

## لکھنؤ میں

علی لطف کا قیام دہلی میں واقعتاً کس سنہ تک رہا اس کا حوالہ ہم کو کسی تذکرہ میں نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں بھی واقعاتی شہادتوں سے مدد لے کر ان کے دہلی سے روانہ ہونے کے ایک تخمینی سنہ کا پتہ چلانا پڑتا ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ ۱۱۸۷ھ تک دہلی میں مقیم رہے اور اس کے بعد وہ لکھنؤ گئے۔ ہمارے اس قیاس کی بنیاد خود لطف کے بعض بیانات ہیں۔ "گلشن ہند" میں انھوں نے اپنے زمانے کے بعض مشاہیر شعرا کے دہلی سے لکھنؤ آنے کے سنین لکھے ہیں۔ چنانچہ میر قمر الدین خاں منت کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۱ھ میں وہ دہلی سے لکھنؤ آئے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے لطف لکھنؤ آ چکے تھے۔ لیکن آخر وہ کس سنہ میں لکھنؤ آئے اس کے مزید تعین میں ہم کو لطف کے اس بیان سے مدد ملتی ہے جس میں انھوں نے آصف الدولہ سے اپنے توسل کا ذکر کیا ہے۔ اس کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔ آصف الدولہ کی تخت نشینی کے بعد ہی لطف اور ان کے والد دونوں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ ان کے دہلی سے نکلنے کے اسباب میں سے ایک سبب تو دہلی کی تباہی تھی، لیکن اس کا سب سے اہم سبب نواب آصف الدولہ سے ان کے خاندانی مراسم تھے۔ ان واقعات کے مدنظر ہم ان کے لکھنؤ جانے کا ایک تخمینی سنہ ۱۱۸۷ھ متعین کر سکتے ہیں۔ عبد الجبار خاں ملکاپوری کا یہ بیان کہ لطف دہلی سے بنگالہ گئے[1]

---

[1] محبوب الزمن ج ۲ ص ۷۱۹

اوپر کی تفصیلات کی روشنی میں صحیح نہیں ہے۔

لطف نے اپنے تذکرہ میں ان حالات پر کسی حد تک روشنی ڈالی ہے، جن کی وجہ سے دہلی کے اکثر شعرا، وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں دہلی حوادث کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ لطف، میر قمرالدین خاں منت کے دہلی چھوڑنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ویرانی شاہجہاں آباد کے باعث لکھنؤ میں ان کا آنا ہوا۔"[1]

تذکرہ "گلشن ہند" کے مختلف بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ، دہلی کی سیاسی اور سماجی زندگی میں یہ نہایت ہی خلفشار کا دور تھا۔ ایک طرف نیا۔ نفس حکمرانوں کی بے بسی تھی، تو دوسری طرف عمائدین سلطنت کی سازشیں اور ادنیٰ ملازمین کی کورنمکی۔ ان سب پر مستزاد انگریزوں کی ریشہ دوانیاں اور اپنی قوت کو مستحکم کرنے کی شاطرانہ چالیں تھیں۔ اصل میں یہ وہ واقعات ہیں، جو قدیم جاگیرداری نظام کی عمارت کے تزلزل کا پتہ دیتے ہیں۔ لیکن وہی دربار، جو پرانی جاگیردارانہ روایات کے محافظ تھے شعرا اور علما کی سرپرستیوں کے بھی مرکز تھے۔ ان مرکزوں کی خستہ حالی، شاعروں کے دربدر ہونے کا باعث بنی۔

دہلی کی اس زبوں حالی کے مقابلے میں، لکھنؤ ذرا امن کی جگہ تھی خاص طور پر آصف الدولہ کی تخت نشینی کے بعد، ان کی سرپرستیوں اور

---

[1] گلشن ہند ص ۱۷۱۔

قدردانیوں نے دہلی کے سربرآوردہ سخن سنجوں اور اہل کمال کو لکھنؤ کھینچ لیا تھا۔ چنانچہ سراج الدین علیخاں آرزو آئے، سودا آئے، میر آئے اور سربرآوردہ شعرا ایں سوائے درد کے کوئی وہاں باقی نہیں رہا۔ لکھنؤ میں شعرا کے اس غیر معمولی اجتماع کی وجہ سے لکھنؤ رشک دہلی بن گیا تھا، ان کی نغمہ سنجیوں سے یہاں کا کوچہ کوچہ گونج رہا تھا۔ لطف کو لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں آصف الدولہ کی سرپرستیوں کی بدولت جو فراغت اور جو عزت و جاہ اور طمانیت میسر آئی، اس کا ذکر انھوں نے آصف الدولہ کے بیان میں اس طرح سے کیا ہے۔

"افراط عنایت اور الطاف سے اس کے ہم چشموں میں
اپنے مورد امتیاز تھا[1]"

حیدرآباد آنے کے بعد وزیر دکن، ارسطو جاہ کی مدح میں انھوں نے جو قصیدہ لکھا تھا اس میں اپنی گزشتہ فراخی کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

کل ہی کی بات ہے، یہ یافروطن میں تھا ۔۔۔ سو دو سو آشنا کا حق بندگی گزار[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں جو شعری محفلیں اور شعرا کی جو صحبتیں میسر آئیں، ان کی بدولت لطف کی اردو شاعری کی صلاحیتیں ابھر آئیں، اور ان

---

۱۔ گلشن ہند ص ۱۴

۲۔ مخطوطہ دیوان لطف، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ۔

زیادہ تر اردو میں کہنے لگے تھے۔ لکھنؤ ہی کی شعری صحبتوں میں، ان کی شاعری کا خمیر تیار ہوا اور ان کی فکر کا ایک مزاج بنا۔

**تلمذ** اردو میں لطف کس سے مشورہ کرتے تھے، اس بارے میں اختلافات ہیں۔ لطف کے معاصر شاہ کمال نے انھیں سودا کا شاگرد بتایا ہے[۱]۔ قدرت اللہ قاسم[۲] اور عشق[۳] بھی انھیں سودا ہی کا شاگرد لکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں لطف کے سودا کا شاگرد ہونے کی شہرت عام ہوگئی تھی۔ مصحفی نے جس انداز سے ان کے سودا کے شاگرد ہونے کی تردید کی ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ افواہ عام تھی، اور اس کا ذمہ دار مصحفی خود لطف کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ لطف کی مثنوی کی تعریف کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

"ازیں جہت خود را، بہ شاگردی مرزا متہم می کند۔ واللہ اعلم بالصواب[۴]"

شیفتہ کا بیان ان سب سے الگ ہے۔ وہ لطف کو میر تقی میر کا شاگرد بتاتے ہیں[۵] اور انھیں کی تقلید میں قطب الدین باطن نے بھی لطف کو میر کا شاگرد لکھا ہے[۶]۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اس کی تردید کی ہے،

---

[۱] مخطوطہ مجمع الانتخاب ورق ۱۶۷ ا [۲] مجموعہ نغز ج ۲ ص ۱۴۸

[۳] طبقات سخن، بحوالہ یادگار شعرا ص ۱۷۱ [۴] تذکرہ ہندی ص ۲۰۱

[۵] گلشن بے خار ص ۱۶۷ [۶] گلستان بے خزاں ص ۲۰۲

اور شیفتہ کی غلط فہمی کی بنیاد وہ میر کے حالات میں لطف کے مدح سرایانہ انداز نگارش کو سمجھتے ہیں[1]۔ لیکن لطف کی تحریر میں واقعتاً کوئی ایسی بات نہیں ملتی، جس سے ان کے بارے میں میر کے شاگرد ہونے کا نتیجہ نکالا جا سکے۔

لطف کے تلمذ کی گفتگو میں خود ان کے بیان کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات زیادہ قابل اعتبار نہیں ہو سکتے۔ لطف کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ اردو میں کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ لکھتے ہیں:

"مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے[2]"۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ، لطف کی یہ تحریر ۱۲۱۵ھ کی ہے۔ جب کہ وہ پچاس برس کی عمر کے قریب پہنچ چکے تھے۔

**مراسم** لطف کے مراسم لکھنؤ میں اپنے معاصر شعرا میں سے اکثروں کے ساتھ نہایت گہرے رہے۔ ان کے قیام لکھنؤ کے بارے میں کچھ نئی معلومات ہم کو ان کے معاصر شاہ کمال کے تذکرہ سے حاصل ہوتی ہیں، جو اسی زمانے میں لکھنؤ آ گئے تھے۔ یہ معلومات ابھی تک منظر عام پر نہیں آ سکی ہیں۔ شاہ کمال جن کی طرف اس سے قبل اشارہ گزر چکا ہے، کڑہ مانک پور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کو عظیم آباد کے نواح میں جاگیر عطا ہوئی تھی، جس کے باعث یہ وہیں منتقل ہو گئے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد وہ گھر سے نکلے

---

[1] مقدمہ گلشن ہند ص ۱۴

[2] گلشن ہند ص ۱۴۷

اور گھومتے ہوئے ۱۱۹۰ھ کے قریب لکھنؤ آئے اور ۱۲۱۴ھ تک وہیں رہے لکھنؤ میں ان کی ملاقات لطف سے بھی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لطف کے والد مرزا کاظم بیگ کو کبوتروں کا شوق تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں کہیں سے "نیلہ بھورہ" کا ایک نادر جوڑا آیا تھا۔ اس کے قد و قامت کی وجہ سے جوڑے کی شہرت سارے شہر میں ہو گئی تھی۔ اس کو دیکھنے کیلئے شاہ کمال مرزا مغل کمتر[1] کے ساتھ، مرزا کاظم بیگ کے گھر گئے تھے، جہاں ان کی ملاقات لطف سے پہلی دفعہ ہوئی۔ شاہ کمال لکھتے ہیں کہ لطف سے ان کے تعارف کے بعد وہیں کچھ دیر صحبت شعر و سخن گرم رہی۔[2]

لطف کے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں شاہ عالم کے ولی عہد مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ لکھنؤ آئے۔ ان کے لکھنؤ آنے کا سبب دہلی کے امراء کی ناموافقت تھی۔ لکھنؤ آنے کے بعد آصف الدولہ نے بہ حیثیت شہزادہ کے، ان کا پورا احترام ملحوظ رکھا اور گھڑیوں ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ جہاں دار شاہ کو شعر و سخن سے گہرا لگاؤ تھا، چنانچہ ان کے یہاں مہینے میں دو بار مشاعرے کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں ان محفلوں میں شرکت کے لئے سارے سربرآوردہ شعرا چوبدار بھیج کر بلائے جاتے تھے۔ لطف لکھتے ہیں کہ انھیں بھی محفل میں شرکت کے لئے طلب کیا گیا تھا، لیکن وہ نہیں گئے اور جو جواب کہلا بھیجا تھا، اس سے

---

[1] مرزا مغل کمتر جرأت کے شاگرد اور شاہ کمال کے استاد بھائی تھے (مجمع الانتخاب ورق ۱۶۸۰)

[2] مخطوطہ مجمع الانتخاب ورق ۱۶۷۹

ان کی طبیعت کی خودداری اور آزادہ روی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے کہلا دیا۔ "کمترین نے مشاعرہ کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے۔" اور اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی تھی۔ "ازبس کہ ان صحبتوں میں مناظرہ ہی کو یاران عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے۔" اس کے ساتھ ساتھ، انھوں نے شہزادہ کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بھی عرض کی تھی کہ "اگر ارشاد ہو تو سوائے مشاعرہ کے ایک دن بندگی میں حاضر ہوں اور اس تخم ناکاشتنی بے مغز کو موافق ارشاد کے زمین عرض میں بووں[1]۔"

لیکن لطف کا یہ عذر قبول نہ ہوا۔ چوبدار کو دوبارہ بھیجا گیا اور یہ ارشاد ہوا کہ۔ "تیرا حاضر ہونا مشاعرہ میں نہایت ضرور ہے۔ مناظرہ کا مطلق ہمارے ہاں نہیں دستور ہے۔" اس اصرار کے باوجود لطف کا مشاعرہ میں جانے کا قصد نہیں تھا۔ لیکن آصف الدولہ کے ایما پر شہزادہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشاعرہ میں شرکت کی۔

محفلِ مشاعرہ کی تفصیلات میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ لطف کی غزلوں پر بہت داد ملی اور مکرر پڑھوائی گئیں۔ غزل کے ہر ہر شعر پر شہزادہ کے تفضلات اور عنایات مبذول رہے[2]۔

لطف نے لکھنؤ کے مشاعروں کے سلسلے میں جس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کا آغاز اسی زمانے سے ہوا اور مصحفی، انشا، جرات

---

[1،2] گلشن ہند ص ۲،۷

رنگین وغیرہ کے عہد میں مناظرہ پسندی اپنے منتہا کو پہنچ گئی۔

جہاں دار شاہ بعد میں بنارس چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۰۱ھ میں ان کا انتقال ہوا[1]۔ اسی سنہ میں مصحفی لکھنؤ آئے تھے۔ ۱۱۹۷ھ میں میر بھی لکھنؤ آگئے۔ اس زمانے تک سودا کا انتقال ہو چکا تھا[2]۔ آصف الدولہ نے میر کی قرار واقعی قدر و منزلت کی اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر دیا۔

میر کی تنک مزاجی کے بارے میں جو روایتیں چلی آرہی ہیں، ان میں کبھی کبھی مبالغے سے بھی کام لیا گیا ہے۔ لیکن یہ روایتیں بے بنیاد بھی نہیں تھیں۔ چنانچہ لطف کی معاصرانہ شہادت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی۔ لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا[3]۔"

آگے لطف نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ مشاہرہ آصف الدولہ کے جانشین نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ لطف کے اس بیان سے مولانا محمد حسین آزاد کی روایت کی تکذیب ہوتی ہے کہ میر نے نواب سے بگاڑ کر لیا اور گھر بیٹھ رہے اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی[4]۔

---

۱ء گلشن ہند ص ۲۷ — ۳ء آبحیات

۲ء ″ ″ ص ۱۵۳ — ۴ء ص ۲۱۱

جب تک آصف الدولہ بقید حیات رہے لطف کو لکھنؤ چھوڑنے کا خیال نہیں آیا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ قیام لکھنؤ کے دوران میں عظیم آباد، مرشد آباد اور اطراف و اکناف میں سیر و سیاحت کی اور کچھ عرصہ قیام کیا[۱]۔ بعض تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ لطف عظیم آباد میں سکونت رکھتے ہیں۔ چنانچہ شیفتہ[۲]، ناسخ[۳] اور "بزم سخن"[۴] کے مرتب نے ان کی سکونت عظیم آباد بتائی ہے۔ لطف مرشد آباد بھی گئے تھے اس کا ذکر آشفتہ کے بیان میں انھوں نے جس طرح سے کیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۰۸ھ میں مرشد آباد میں تھے۔ لکھتے ہیں:

"حکیم رضا قلی خاں آشفتہ تخلص راقم آثم کے دوستان قدیم سے ہیں.... ۱۲۰۸ھ میں لکھنؤ سے مرشد آباد میں آئے"[۵]

آشفتہ کے مرشد آباد آنے کی وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے کہ نواب مبارک الدولہ ناظم صوبہ بنگالہ سخت علیل تھے اور آشفتہ کو اپنے علاج کے لئے طلب کیا تھا[۶]۔ "آشفتہ میر سوز سے اصلاح لیتے تھے"[۷]

---

۱۔ نغمہ عندلیب ص ۲۰۲ - ۲۔ گلشن بے خار ص ۱۶۷، نیز خطبات گارساں دتاسی ص ۸۴

۳۔ سخن شعرا ص ۴۰۵ ۴۔ بزم سخن ص ۱۰۱

۵۔ گلشن ہند ص ۵۱۔ مصحفی نے ان کا نام مرزا ضیا قلی خاں لکھا ہے (تذکرۂ ہندی ص ۱۸) لیکن شیفتہ اور قاسم رضا قلی خاں ہی لکھتے ہیں (گلشن بے خار ص ۱۳۔ مجموعہ نغز ج ۱ ص ۳۴)

۶، ۷۔ گلشن ہند ص ۵۱۔

آصف الدولہ کا انتقال ۱۲۱۲ھ میں ہوا۔ اپنے مربی کے سانحۂ ارتحال کا لطف پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اس حادثے پر انھوں نے ایک قطعۂ تاریخ کہہ کر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا ہے:

آصف الدولہ جب جہاں سے گیا — اک جہاں بے دل و دماغ ہوا
جام عمر اس کا بھرتے ہی لبریز — خلق کا عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتش غم سے — دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سال تاریخ کا خیال کیے — خشک شعر و سخن کا باغ ہوا
بولے یوں دور کر کے پائے عنا — آج گل ہند کا چراغ ہوا

۱۲ — ے — ۱۲

## لکھنؤ سے روانگی

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد لطف کا جی لکھنؤ سے اچیٹ گیا۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ آصف الدولہ کے جانشین نواب سعادت علی خاں کی سرپرستی انھیں حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ ان کے ایک شعر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انشا، مصحفی، رنگین اور جرأت کی معرکہ آرائیوں کی وجہ سے شعر و سخن کی محفلیں رزمگاہ بنی ہوئی تھیں۔ لطف کہتے ہیں:

شور زغن و زاغ یہی ہے جو چمن میں
تو نغمہ سرایان چمن یاں سے چلے ہم

بہرحال ۱۲۱۲ھ کے بعد لطف لکھنؤ سے مرشد آباد چلے گئے۔ لکھنؤ میں لطف کو آرام اور اطمینان کی زندگی میسر آئی تھی اور یہ ان کا وطن بن چکا تھا،

آصف الدولہ ان کے قدر دان تھے، اس کے علاوہ عوام اور ادبی حلقوں میں بھی ان کی قدر و منزلت تھی۔ لکھنؤ کی شعری فضا سے انھوں نے استفادہ بھی کیا تھا، اس لئے لکھنؤ سے نکلنے کے بعد سے لے کر حیدرآباد پہنچنے تک انھیں آرام اور سکون میسر نہ آسکا۔ چنانچہ وہ لکھنؤ، عظیم آباد، مرشد آباد اور کلکتہ کے مابین گھومتے رہے۔ پستی کے لمحات میں جب کبھی انھیں وطن اور دوستوں کی یاد ستاتی تو کہہ اٹھتے:

جب سے کھینچا لطف رنج فرقت یار و دیار
اب ہوئی معلوم محنت گردش ایام کی

یہ غزل غالباً لکھنؤ سے نکلنے کے وقت کہی گئی تھی۔ چنانچہ اس میں تاثر کا تسلسل موجود ہے۔ لکھنؤ سے رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا:

رخصت اے اہل وطن اب ہم ہیں اور آوارگی
حق رکھے بنیاد قائم گردش ایام کی

مسافرت کے زمانے میں لکھنؤ کے کوچوں کی یاد ان کے دل کو رہ رہ کر تڑپاتی تھی۔ کہتے ہیں:

یاد نے ان تنگ کوچوں کی فضا صحرا کی دیکھ
ہر قدم پر جان ماری ہے دل ناکام کی

وطن سے بے وطن ہونے کے بعد اپنے ملنے جلنے والوں اور بے تکلف احباب کا خیال رہ رہ کر ان کے دل کو ستاتا اور ان کی صحبتوں کی یاد آتی تو کہہ اٹھتے:۔

دیکھنا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی
ان سے ہیں مسدود راہیں نامہ و پیغام کی[1]

لطف کے مرشد آباد جانے کے سنہ کا کسی تاریخ یا تذکرے سے پتہ نہیں چلتا۔ لیکن خود ان کے ایک ضمنی بیان سے جو میر سوز کے سلسلے میں آیا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آصف الدولہ کے انتقال کے سال ہی مرشد آباد چلے گئے۔ میر سوز کے مرشد آباد آنے کے بارے میں لطف نے جس انداز سے اطلاع بہم پہنچائی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ خود بھی مرشد آباد میں تھے۔ لکھتے ہیں :-

"۱۲۱۲ھ میں مرشد آباد تک تشریف لائے۔"[2]

لطف کے بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مرشد آباد میں قیام کے لئے فضا سوز کے سازگار نظر نہ آئی، اس لئے وہ تھوڑے دنوں بعد مرشد آباد سے لکھنؤ لوٹ گئے۔[3] لطف نے سوز سے آصف الدولہ کے تلمذ کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ لالہ سری رام[4] اور رام بابو سکسینہ[5] نے لکھا ہے کہ سوز کے لکھنؤ آنے کے بعد آصف الدولہ نے ان کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ لالہ سری رام اور سکسینہ دونوں کا بیان یہ ہے کہ سوز کے ۱۲۱۲ھ میں

---

۱۔ مخطوطہ دیوان لطف جامعہ عثمانیہ
۲۔ گلشن ہند ص ۱۱۳
۳۔ گلشن ہند ص ۱۱۳
۴۔ خمخانۂ جاوید ج ۴ ص ۲۷۶
۵۔ تاریخ ادب اردو ص ۱۲۴۔

مرشد آباد سے لکھنؤ آنے کے بعد آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوئے تھے۔
لیکن ان دونوں مصنفین کے بیانات غلط فہمی پر مبنی ہیں، وہ لکھتے ہیں
کہ سوز مرشد آباد سے لکھنؤ لوٹنے کے دو برس کے اندر انتقال کر گئے۔ اصل
واقعہ یہ ہے کہ آصف الدولہ کا انتقال ۱۲۱۲ھ میں ہوا[1] اور لطف
کے بیان کے مطابق خود سوز بھی اسی سال رحلت کر گئے[2] اس بنا پر
لالہ سری رام اور سکسینہ کے بیانات درست نہیں رہتے کہ سوز مرشد آباد
سے لوٹنے کے دو برس کے اندر انتقال کر گئے۔ رام بابو سکسینہ سے اس
سلسلے میں ایک غلط بیانی بھی سرزد ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لطف
نے سوز کے انتقال کا سنہ ۱۲۱۳ ہجری بتایا ہے۔ یہ صریحاً بے بنیاد ہے
تذکرے میں صاف طور پر ۱۲۱۲ھ درج ہے۔ رام بابو سکسینہ نے اس غلطی کو
بنیاد بنا کر سوز کے سنہ وفات کے بارے میں مزید بحث کرنے کی کوشش
کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کے خیال میں لطف کا بتایا ہوا
سنہ وفات (۱۲۱۳ھ) ہی درست ہے۔

اسی سلسلے میں "گلزار ابراہیم" کے مرتب کی ایک غلطی کا ازالہ
بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سوز کے حالات میں انھوں نے "گلشن ہند"
کے بیان کو "گلزار ابراہیم" کا بالکل ترجمہ[3] لکھا ہے۔ یہ علانیہ

---

[1] گلشن ہند ص ۱۴۱

[2] گلشن ہند ص ۱۱۳

[3] گلزار ابراہیم ص ۱۵۱

خلاف واقعہ ہے، کیونکہ علی ابراہیم تذکرہ کے اختتام کے بعد کے واقعات یعنی سوز کے مرشد آباد آنے اور ان کے ۱۲۱۲ھ میں انتقال کی پیشگوئی کیسے کر سکتے تھے! یہ تفصیلات لطف کا اضافہ ہیں۔

شواہد سے یہ ظاہر ہے کہ لطف مرشد آباد سے پھر لکھنؤ آئے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ دوبارہ مرشد آباد چلے گئے۔ یہ تفصیل بھی ہم کو اتفاق سے لطف ہی کے بیان سے فراہم ہوئی ہے۔ لطف نے جہاں شیر علی افسوس کی لکھنؤ سے کلکتہ کو روانگی کا تذکرہ کیا ہے یہ بھی لکھا ہے کہ خود وہ افسوس سے صرف دو مہینے قبل لکھنؤ سے مرشد آباد روانہ ہوئے تھے۔ افسوس کلکتہ جاتے ہوئے مرشد آباد سے گزرے اور لطف ہی کے یہاں قیام کیا۔[1] جب وہ کلکتہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو لطف کو بھی کلکتہ آنے کے لئے آمادہ کرتے گئے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ لطف کے کلکتہ جانے کا باعث دراصل شیر علی افسوس ہی ہوئے۔

**کلکتہ میں**

قیاس یہ ہے کہ افسوس ۱۲۱۴ھ/۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچ گئے تھے۔ فورٹ ولیم کالج اسی سنہ میں قائم ہوا تھا۔

افسوس کے لکھنؤ سے روانہ ہونے کے سنہ کے بارے میں مرتب "ارباب نثر اردو" کا بیان ہے کہ ۱۸۰۰ء میں کرنل اسکاٹ نے ان کا تقرر منشی کی حیثیت سے کرکے انھیں کلکتہ بھیجا تھا۔[2] لیکن ان کے ایک اور بیان کے بالمواجہ یہ سنہ

---

[1] گلشن ہند ص ۴۹ [2] ارباب نثر اردو ص ۸۵

درست نہیں رہتا کہ افسوس کی "باغ اردو" کا آغاز ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں ہوا تھا۔[1] افسوس کے ۱۲۱۴ھ میں کلکتہ پہنچنے کی تائید لطف کے ایک ضمنی اندراج سے بھی ہوتی ہے۔ حکیم رضا قلی خاں آشفتہ کے حالات میں ان کے کلکتہ آنے کا تذکرہ لطف نے جس انداز سے کیا ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آشفتہ سے پہلے لطف کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ اس کے قطعی تعین میں ہم کو اس بات سے مدد ملتی ہے کہ آشفتہ غرہ ذیحجہ ۱۲۱۴ھ کو کلکتہ پہنچے۔ اس کے مہینے بھر بعد ہی ۱۲۱۵ھ شروع ہو جاتا ہے۔

"گلشن ہند" کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

> "غرۂ ذیحجہ کو ۱۲۱۴ھ (بارہ سو چودہ ہجری) میں اپنے ہی مزاج نازک سے ناحق روزگار چھوڑ کلکتہ میں چلے آئے۔"[2]

لطف کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ارادہ کلکتہ میں قیام کا نہیں تھا، بلکہ وہ حیدرآباد جانا چاہتے تھے۔ اس کا سبب دراصل یہ تھا کہ اس زمانہ میں نظام علی خاں آصف جاہ ثانی اور ان سے زیادہ ان کے وزیر مشیر الملک ارسطو جاہ کی سرپرستیوں اور شاعر نوازیوں کا چرچا ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گیا تھا۔ آصف الدولہ کے انتقال کے بعد لطف کو بھی ظاہر ہے کہ کسی سرپرست کی تلاش تھی اور حیدرآباد جا کر قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کلکتہ میں ڈاکٹر

---

[1] ارباب نثر اردو ص ۹۱

[2] گلشن ہند ص ۵۲

گلکرسٹ سے ان کی ملاقات ہوئی اور اس ملاقات کا باعث غالباً افسوس ہی تھے۔ گلکرسٹ لطف کے علم و فضل اور ادبی صلاحیتوں سے یقیناً متاثر ہوئے، اتفاق سے کچھ ہی عرصہ پہلے علی ابراہیم خاں خلیل کا تذکرہ "گلزار ابراہیم" مرتب ہوا تھا؛ اور گلکرسٹ کو یہ خیال ہو رہا تھا کہ اس فارسی تذکرہ کو، شعرا کے حالات اور کلام کے اضافے کے ساتھ اردو میں لکھوایا جائے۔ علی لطف سے انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا اور بقول لطف کے ان سے کہا:

"تو اگر تن دہی اس مقدمہ میں کرے تو ہم اس تذکرے کو اپنی خاطر زیر پر لکھیں"[1]

علی لطف لکھتے ہیں کہ گلکرسٹ نے یہ فرمائش ایسی محبت اور اخلاق سے کی کہ انھوں نے حیدر آباد جانے کا خیال ترک کر دیا اور گلشن ہند کی تدوین کی طرف متوجہ ہوئے۔

گلکرسٹ کے ذہن میں گلزار ابراہیم کو اردو میں لکھوانے کا جو مقصد تھا، اس کا بھی علی لطف نے اظہار کر دیا ہے۔ اسے اردو میں منتقل کرنے سے گلکرسٹ کا منشا یہ تھا کہ انگریز عہدہ دار جو ولایت سے ہندوستان میں تازہ وارد ہوتے ہیں، انھیں اردو زبان کے سکھانے اور اردو شعرا کے حالات اور ان کے کلام سے روشناس

---

[1] گلشن ہند مقدمہ ص ۳۔

کرانے میں مدد مل سکے۔ گلکرسٹ نے علی لطف سے یہ بھی فرمایش کی کہ تذکرہ سادہ اور سلیس زبان میں لکھا جائے تاکہ نومشق انگریزوں کو عبارت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ گلکرسٹ کو انگریز عہدہ داروں کے اردو سیکھنے کی کتنی فکر تھی، اس کا اندازہ اس بیان سے ہوتا ہے جو لطف نے "گلشن ہند" کے دیباچے میں نقل کیا ہے۔ بیان یہ ہے:

"فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہیں یہ ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں، ہم ان کی تربیت کے لئے سارا یہ خون جگر کھاتے ہیں تاکہ ان کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت اس سے بخوبی مزا اٹھاوے۔"[1]

شیر علی افسوس جن کے اصرار پر لطف کلکتہ گئے تھے، ان سے لطف کی اکثر ملاقاتیں رہا کیں۔ افسوس کا پہلا کارنامہ "باغ اردو" جو "گلستانِ سعدی" کا ترجمہ ہے، لطف کے قیام کلکتہ کے دوران میں شروع ہو چکا تھا، چنانچہ لطف افسوس کے انگریز عہدہ داروں سے مراسم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ ہیں، بلدہ کلکتہ میں صاحبان عالی شان کے ساتھ میر مذکور ملاقاتیں بہ عزت تمام

---

[1] گلشن ہند۔ دیباچہ ص ۳۔

رکھتے ہیں اور گلستاں کے ترجمے کا کمپنی کی سرکار سے

کام رکھتے ہیں[1]۔"

## فورٹ ولیم کالج کے لئے عُلما کا انتخاب

لطف کے بیان سے فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کے تقرر کے طریقے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کالج کے عہدہ دار علما کے انتخاب کے لئے لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کرنل اسکاٹ کو لکھتے تھے تاکہ وہ سربرآوردہ علما اور ادیبوں سے ملاقات کرکے ان میں سے موزوں اصحاب کا انتخاب کریں اور کلکتہ بھیجیں۔ ان کا مشاہرہ بھی یہیں مقرر ہو جاتا اور سفر کے اخراجات کے لئے نقد رقم بھی دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں لطف نے میر تقی میر کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ کرنل اسکاٹ نے میر کی شہرت کا لحاظ کرتے سب سے پہلے انھیں کو طلب کیا تھا، لیکن وہ اس وقت تک اتنے معمر ہو چلے تھے کہ ان کا انتخاب مناسب نہیں سمجھا گیا۔ مولوی عبدالحق کا خیال یہ ہے کہ ان کی جگہ افسوس کا انتخاب عمل میں آیا تھا[2]، لیکن خود لطف کی عبارت سے اس طرح کا کوئی مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔ میر کی کرنل اسکاٹ سے ملاقات کا تذکرہ کرنے کے بعد لطف نے ایک بات یہ بھی لکھی ہے کہ

---

[1] گلشن ہند ص ۴۹
[2] گلشن ہند ص ۱۵۲
[3] ایضاً مقدمہ ص ۸

لکھنو میں کلکتہ کی ملازمت کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہاں "شاعری کی جا در خواست حمالی ہے"[1] یہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس زمانے تک لوگ انگریزوں کی نوکری کے بارے میں اچھا خیال نہیں رکھتے تھے۔

## حیدر آباد کو روانگی

"گلشن ہند" کی تکمیل ۱۲۱۵ھ میں ہوئی اور اس کے بعد لطف کلکتہ سے حیدر آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے حیدر آباد آنے کے سنہ کا بھی حوالہ نہیں ملتا لیکن قیاس یہ ہے کہ وہ اسی سنہ میں حیدر آباد آ گئے، کیونکہ کلکتہ میں قیام کے زمانے ہی سے انھیں حیدر آباد آنے کی خواہش تھی، لیکن "گلشنِ ہند" کی ترتیب کی مجبوری کی وجہ سے وہ کلکتہ میں رک گئے تھے اور کام کی تکمیل کے بعد ہی وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اس سلسلے میں مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک عجیب بات یہ لکھی ہے کہ گلکرسٹ کی فرمایش کی تکمیل کے بعد نہیں تو وہ اس سے پہلے ضرور حیدر آباد میں تشریف رکھتے تھے[2] اور اس کا سبب مولوی صاحب وہ قصاید بتاتے ہیں جو لطف نے اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھے تھے۔ ارسطو جاہ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے وزیر اور اردو اور فارسی شعرا کے بڑے قدر دان اور سرپرست تھے۔ ان کا زمانہ وزارت ۱۲۱۹ھ تک رہا۔ ظاہر ہے کہ لطف کے کلکتہ سے حیدر آباد آنے کے بعد بھی وہ چار برس تک زندہ رہے اور ان کی مدح میں لطف کے قصیدے اسی زمانے میں

---

[1] گلشن ہند ص ۱۵۲ [2] گلشن ہند مقدمہ ص ۱۱

لکھے گئے۔ اس طرح ارسطو جاہ کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا درست ہے اور نہ ضروری کہ لطف "گلشن ہند" کی ترتیب سے پہلے حیدر آباد آئے تھے۔ لطف کے ایک حیدر آبادی معاصر غلام حسین خاں جوہر کے بیان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آصف جاہ ثانی کے عہد حکومت (۱۱۷۵ھ - ۱۲۱۸ھ) میں حیدر آباد آئے۔ جوہر نے اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ وہ بنگالہ سے حیدر آباد آئے تھے[1]۔

جوہر کے اس بیان کے بعد مولوی صاحب کا یہ قیاس کہ لطف گلکرسٹ کی فرمائش کی تکمیل کے "بعد نہیں تو اول" ضرور حیدر آباد میں تشریف رکھتے تھے، درست نہیں رہتا۔ یہ بات بہرحال سمجھ میں نہیں آتی کہ مولوی صاحب کو "بعد نہیں تو" فرض کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟

لطف کے حیدر آباد آنے کے زمانے کا تعین کرنے کے سلسلے میں ہم کو ان کے ایک اور معاصر شاہ کمال کی فراہم کی ہوئی معلومات سے بھی مدد ملتی ہے۔ شاہ کمال لطف سے ایک سال پہلے حیدر آباد آ گئے تھے۔ وہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ ان کے حیدر آباد آنے کے ایک سال بعد، اتفاق زمانہ سے لطف بھی حیدر آباد آ گئے۔ شاہ کمال خود آصف الدولہ کی وفات (۱۲۱۲ھ) کے ڈیڑھ دو برس بعد جب ان کے سرپرست، مہاراجہ ہلاس رائے اور راجہ ٹکیت رائے کا بھی انتقال

---

[1] گلزار آصفیہ ص ۔ ۵۸

ہو گیا تو وہ حیدر آباد چلے آئے اس لحاظ سے شاہ کمال کے حیدر آباد آنے کا سنہ ۱۲۱۴ قرار پاتا ہے۔ اسی مناسبت سے لطف کے حیدر آباد آنے کا سنہ قطعی طور پر ۱۲۱۵ متعین ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یقین ہے کہ وہ "گلشن ہند" کی تدوین سے قبل حیدر آباد نہیں آئے، کیونکہ کلکتہ پہنچنے کے زمانے سے ہی انھیں حیدر آباد جانے کی خواہش تھی جس کا انھوں نے اپنے دیباچہ میں اظہار کیا ہے۔ ان کے بیان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ "گلشن ہند" کی تدوین تک حیدر آباد نہیں آئے تھے۔ میرے اس خیال کی مزید توثیق کہ لطف سنہ ۱۲۱۵ تک حیدر آباد نہیں آئے اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے قصیدے جو ارسطو جاہ کی مدح میں لکھے گئے ہیں "مجموعہ فصاحت" میں شامل نہیں ہیں۔ "مجموعہ فصاحت" ۱۲۱۵ سے کا مرتبہ ہے اور اس میں وہ سارا کلام شامل ہے جو ارسطو جاہ کے دربار کے متوسل شعرا نے ان کی مدح میں سرانجام کیا تھا۔

کلکتہ سے لطف کو لکھنؤ جانے کا خیال نہیں آیا۔ اس کا ایک ظاہر سبب تو یہ تھا کہ ان کے مربی آصف الدولہ اس جہان سے اٹھ چکے تھے، اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی، لکھنؤ میں شعرا کی آپس کی چشمکیں ان کی سنجیدہ طبعی کے منافی تھیں، جس کی وجہ سے انھوں نے شہزادہ جہاندار شاہ کی محفل سخن میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ لکھنؤ سے نکلتے ہوئے انھوں نے جو شعر کہا تھا اس میں مشاعروں کے اسی شور و شغب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کلکتہ میں قیام اور انگریزوں سے میل جول کی وجہ سے بھی ان کے مذاق کے ثقہ پن میں اضافہ ہو گیا تھا۔

لطف کی یہ افتاد طبع میر کی ذہنیت کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ میر نے

دہلی سے نکلنے کے بعد ایک غزل کہی تھی، جو طویل اور مسلسل ہے، اور ایک طرح پر دہلی کے شعرا کے نام غریب الوطن شاعر کا پیام ہے۔ اس کا مطلع ہے:

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار

کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار

اس غزل میں میر نے بھی "زاغ و زغن" اور "غوغائیوں" پر تعریض کی ہے۔

## حیدرآباد میں

شاہ کمال نے لطف کے حالات میں یہ تفصیل لکھی ہے کہ حیدرآباد آنے کے بعد، جلد ہی وہ ارسطو جاہ، دیوانِ دکن کے دربار سے متوسل ہو گئے تھے۔ ارسطو جاہ کا خاندان ایران سے آیا تھا، اور خود انھیں فارسی شاعری کا اچھا ذوق تھا اور فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ اپنے زمانے کے اکثر فارسی اور اردو شعرا کی انھوں نے سرپرستی بھی کی تھی، چنانچہ ان کی قدردانیوں کا شہرہ سن کر، اکناف ہند، بلکہ ایران سے بھی کئی شعرا حیدرآباد آ گئے تھے۔ ان کا دربار شعرا اور علما کا مرکز اور ملجا بنا ہوا تھا۔ کوئی سو ڈیڑھ سو شعرا ان کے دربار سے مستفیض تھے اور بیش قرار ماہوار پاتے تھے۔

## ارسطو جاہ سے توسل

لطف کے انگریز عہدہ داروں سے جو مراسم رہے تھے، اس کے مدنظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے ریذیڈنٹ، حشمت جنگ، کرک پیٹرک نے بھی ان کی

قدر و منزلت کی ہے۔ چنانچہ انھیں کے میر منشی، عزیز اللہ کے توسط سے وہ ارسطو جاہ کے دربار میں باریاب ہوئے تھے اور شاہ کمال کے بیان کے مطابق اچھی ملازمت سے سرفراز ہوئے[۱]۔ ارسطو جاہ نے انھیں اپنے مصاحبین میں شامل کرکے[۲] ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مقرر کردی تھی[۳]۔ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دربار میں علی لطف، غالباً ارسطو جاہ ہی کی معرفت باریاب ہوئے۔ جوہر کے بیان کے مطابق انھوں نے نظام علی خاں کی مدح میں معرکۃ الآرا قصاید بھی لکھے تھے[۴]۔

آصف جاہ ثانی نے بھی لطف کی سرپرستی کی اور دربار سے چار سو روپیہ ماہوار مقرر کردی[۵]۔ اس کے علاوہ سواری کے لئے ایک پالکی بھی عنایت کی تھی۔ صاحب "تذکرہ ہمیشہ" کا یہ بیان کہ لطف کو چار سو روپیہ ماہوار ارسطو جاہ کے مصاحب کی حیثیت سے ملتے تھے[۶] درست نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آصف جاہ ثانی کے انتقال کے بعد ان کا یہ مشاہرہ مسدود ہو گیا تھا، چنانچہ ارسطو جاہ کی مدح میں انھوں نے جو قصیدے لکھے تھے، ان میں سے ایک قصیدہ میں، وہ شکوہ سنج ہیں کہ ان کے دربار سے جو ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ ملتا ہے، وہ پالکی کے اخراجات

---

[۱] مخطوطہ مجمع الانتخاب ورق ۳۰۳ ا [۲] گلزار آصفیہ ص ۴۷۰
[۳] قصیدہ لطف در مدح ارسطو جاہ [۴] ایضاً ص ۴۷۰
[۵] گلزار آصفیہ ص ۴۷۰۔ [۶] مخطوطہ تذکرہ ہمیشہ ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن۔

کے لئے بھی کفایت نہیں کرتا۔ اسی لئے وہ استدعا کرتے ہیں کہ ان کے مشاہرہ میں ڈیڑھ سو کا اضافہ کر کے پورے تین سو کر دیے جائیں لطف اس توقع کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ ارسطو جاہ جیسے صاحب ثروت امیر کے لئے یہ اضافہ گراں نہیں ہو سکتا۔ ان کے قصیدہ کا اقتباس حسب ذیل ہے:

| | |
|---|---|
| ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکوں | لازم وگرنہ تھا بشریت کو اضطرار |
| ............... | ............................ |
| سرکار سے تری جو زراہ تفضلات | ہے ڈیڑھ سو روپیہ ترے خادم کا ماہوار |
| ہر چند جائے شکر ہے پر عرض کیا کروں | جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل اور نہار |
| بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے | ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار |
| خلق خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی | میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار |
| ............... | ............................ |
| ازبسکہ کم دماغ ہوں تنگی معاش سے | بالفعل تو اضافہ کا ہوں گا امیدوار |

لیکن لطف اضافہ برائے نام نہیں چاہتے۔ چنانچہ کہتے ہیں:—

| | |
|---|---|
| لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام | کافر ہوں سو پچاس میں گر ہو کشود کار |
| تضعیف اصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف | کیونکہ یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار |

آگے وہ شعر ہے جس میں لطف نے اپنی توقع کا اظہار کیا ہے کہ میرے تین سو تجھ پر شاق نہیں ہو سکتے۔ کہتے ہیں:

| | |
|---|---|
| غالب ہے تجھ پہ شاق نہ ہو میرے تین سو | چھ سو جنیوں کو تو نے دیا بلکہ چھ ہزار |

پالکی جس کے "زیر بار" ہونے کا تذکرہ لطف نے اوپر کے اشعار میں کیا ہے وہی ہے جو نظام علی خاں نے انھیں عطا کی تھی۔ نظام علی خاں کے دربار سے جو مشاہرہ انھیں ملتا تھا اس کے مسدود ہو جانے کی وجہ سے پالکی کے مصارف ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئے تھے۔ بات یہ بھی تھی کہ لطف نے لکھنؤ میں، آصف الدولہ کی سرپرستی میں اچھے دن دیکھے تھے، جس کی طرف پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار جو لطف کو ارسطو جاہ کے دربار سے مقرر تھی، وہ ان کے خیال میں ان کے علم و فضل کے مقابلے میں بہت کم تھی، خاص طور پر اس لئے بھی کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ارسطو جاہ کے دربار سے کم سواد لوگوں کو بیش قرار مشاہرے مل رہے ہیں۔ ان حالات میں فطرتاً ان کے لب شکوہ سنجیوں کے لئے وا ہو جاتے ہیں اور "چرخ ستم شعار" کا گلہ وہ اس طرح کرنے لگتے ہیں:-

تجھ سا ہو قدر دان نکات اور یہ نکتہ سنج
یوں ہو اسیر پنجۂ چرخ ستم شعار

لطف کا یہ قصیدہ (۷۵) اشعار کا ایک طویل قصیدہ ہے اور دو مطلعوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ارسطو جاہ کے خاندانی مراتب اور ان کے شخصی اوصاف کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ اسی قصیدہ میں ایک جگہ انھوں نے اپنے سپاہی پیشہ ہونے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس پر غالب کی طرح فخر کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ شعر ہے:-

کیونکہ کہ شاعری مری میراث کچھ نہیں — نے فخر میں سمجھتا ہوں اس کو نہ ننگ و عار
فن سپاہ گری میں ہے وہ کسب کو تسا — جو جانتا نہیں ہیں یہ تائید کردگار
پر اپنا ذکر اپنی زباں سے نہیں ہے خوب — کھل جائے گا وہ تجھ پہ کسی روز وقت کار

اردو شاعری میں طلب اور حسن طلب کے یہ انداز عام ہیں۔ غالب کا "اے شہنشاہ آسماں اورنگ" والا قطعہ بہت مشہور ہے۔ ان سے پہلے ہم کو لطف کا مذکورہ بالا قصیدہ اور شاہ عالم ثانی آفتاب کے استاد حافظ عبدالرحمن خاں احسان کا قطعہ بالکل اسی طرح کا ملتا ہے۔

اس قصیدے کے علاوہ لطف نے ارسطو جاہ کی مدح میں تین اور قصیدے لکھے تھے لیکن لطف کے بارے میں اس سے پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ان کے صرف اس قصیدہ اور میر عالم کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدہ کا ذکر ہے اور خاص طور پر مذکورہ بالا قصیدے سے طول طویل اقتباسات بھی مندرج ملتے ہیں۔ علی لطف کے دوسرے قصیدوں میں ان کا ایک لامیہ قصیدہ بھی اہم ہے جو دو مطلعوں اور (۵۷) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قصیدہ میں انھوں نے بعض علمی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ اس کے علاوہ ارسطو جاہ کے گھوڑے اور ہاتھی کی تعریف میں طبیعت کی روانی اور زور قلم خوب دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس قصیدہ کا مطلع اور کچھ شعر درج ذیل ہیں:—

تھا جو طوطی طبع کا منقار حسرت زیر بال — چہچہے میں آج وا ہے عید کا جیسے ہلال
نغمہ پردازی میں ہے سرگرم اس انداز سے — جس کے آگے ناطقہ ہو مرغ خوش الحاں کا لال

ہر نوائے نغمہ پرور تہنیت آہنگ ہے
ہر صدائے زمزمہ گستر ہے اک فرخندہ فال

جلوہ فرما ہے ارسطو جاہ بہر نذر عید
چار بالش پر وزارت کی بصد جاہ و جلال

وہ ارسطو جاہ جس کی بارگاہ عیش کے
ہیں گے مردود در عشرت سدا رنج و ملال

مرہم زخم غریباں بس کہ ہے ان کا لطف ہے
شام غربت سے عیاں ہے خندہ صبح جمال

لطف کے ایک اور قصیدے کا دوسرا مطلع حسب ذیل ہے:

تجھ سے دُرِ عقل کو یہ گرمی بازار ہے
جا چھپا خجلت سے دریا میں در شہوار ہے

اس قصیدہ میں لطف کا انداز ذوق کے مشہور قصیدہ:

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشہ علم میں سرمست غرور و نخوت

کا سا ہے۔

قصیدہ کی تان اپنے مربی ارسطو جاہ کی مدح پر ہی ٹوٹتی ہے۔

ایک قصیدہ انھوں نے نظام علی خاں کے فرزند جہاندار علی خاں کیوان جاہ کی بسم اللہ کے موقع پر بھی لکھا تھا۔ مورخ غلام حسین خاں جوہر نے اس تقریب کا ذکر کیا ہے[1]۔ اس کے علاوہ "احکم التواریخ" کے مصنف کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریب ۱۲۱۹ھ میں منائی گئی۔ لیکن معین وقت کے آٹھ مہینے بعد کیونکہ نظام علی خاں کے انتقال (۱۲۱۸ھ) کی وجہ سے یہ تقریب ملتوی کر دی گئی تھی۔ ان تفصیلات سے لطف کے اس

---

[1] گلزار آصفیہ ص۔ ۷۴۔

قصیدہ کے لکھے جانے کی تاریخ کا بھی تعین ہو جاتا ہے [1]

لطف نے اس قصیدے میں کیوان جاہ کی جودت ذہن و ذکاوت طبع اور علم و ادب کی بڑی تعریف کی ہے۔ ان کی پرورش ارسطو جاہ کی عام نگرانی میں ہوئی تھی، اس لئے اس نوعمر شہزادے میں مذکورہ بالا اوصاف کا سبب بھی وہ ارسطو جاہ کی تربیت کو قرار دیتے ہیں۔ اسی کو وہ گریز کے طور پر استعمال کر کے آگے ارسطو جاہ ہی کی مدح شروع کر دیتے ہیں اور یوں قصیدہ ختم ہو جاتا ہے۔ قصیدے کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:-

جب بخور عنبر و عیش و صدائے عود جشن
مل کے دونوں نے بہم تا عرش اعظم راہ کی
چرخ ہفتم پر ہوا کیوں ان کا عطر آگیں دماغ
فرط حیرت سے اشارت اس نے سوئے ماہ کی
یعنی اے مسند نشیں چرخ اول دہر میں
محفل دنیا کی تو نے سیر خاطر خواہ کی
کہہ تو کس دولت سرا میں ہیں یہ بزم آرائیاں
رشک جنت جس کی نکہت ہے ترے خرگاہ کی

---

[1] جہاندار علیخاں (ملقب بہ) کیوان جاہ آصفجاہ ثانی کے آٹھویں فرزند تھے۔ مذکورہ بالا بیانات سے ان کا سنہ پیدائش ۱۲۱۴ھ معین ہوتا ہے۔ مورخین نے ان کے بذل اور سخاوت کی تعریف کی ہے۔ تسمیہ خوانی کے چند دن بعد ہی ارسطو جاہ کا انتقال ہو گیا۔ شہزادہ جہاندار علیخاں کی وفات ۱۲۴۳ھ میں ہوئی۔ (گلزار آصفیہ ص ۴۰)۔

ماہ نے سن کر کہا اس بزم کا ہو کس سے ذکر
ہاں مگر اتنا کہ وہ محفل ہے واہی واہ کی
جس کی ہمتائی سے ہے تو چرخ ہفتم پہ امیر
آج ہے تقریب غافل اس کی بسم اللہ کی
یعنی کیواں جاہ جس کی طبع کا بدر منیر
رکھتا ہے خورشید سیمائی دل آگاہ کی

## میر عالم سے وابستگی

لطف ارسطو جاہ کی زندگی تک ان کے دربار سے وابستہ رہے۔ ارسطو جاہ کا انتقال ۱۲۱۹ھ میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد جب میر عالم دیوان مقرر ہوئے تو لطف ان کے دربار سے متوسل ہو گئے اور ان کے مصاحب مقرر ہوئے میر عالم سے توسل کے بعد انھوں نے میر عالم کی مدح میں بھی کچھ قصیدے لکھے تھے۔ یہ قصیدہ ان کے مخطوطہ دیوان مخزونہ جامعہ عثمانیہ میں مندرج ہے۔ قصیدے کا مطلع حسب ذیل ہے:

جہاں وابستہ احساں ہے کس افضال پرور کا
کہ دام صید سعی باز ہے دانہ کبوتر کا

یہ قصیدہ (۶۶) اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں بھی ان کے اکثر قصیدوں کی طرح دو مطلعے ہیں۔ ایک مختصر سی تشبیب کے بعد مدح شروع ہوتی ہے جس میں میر عالم کے عدل اور ان کے مراتب کی بلندی اور جاہ و حشمت کا ذکر کیا ہے۔ آگے لطف نے اپنے بارے میں شاعرانہ تعلی سے بھی کام لیا ہے

اور لکھا ہے کہ:

"ہر نکتہ دانی پر اپنے دعوائے شہنشاہی کی وجہ سے میں اگر اپنا افسر کج رکھوں تو بے جا نہیں ہے کیونکہ میرے اشعار میں لطافت ہے اور ہر شعر سلک گوہر سے کم نہیں اگر میں بت معنی کی صورت تراشی پر آجاؤں تو آذر کا ہنگامہ سرد نہ کردوں تو کافر ہوں۔ جہاں میری طبع صفا پرور عرض ضیا کرے، تو اس جگہ صبح خاور کا منہ بھی فق ہو جائے۔"

لیکن ان ساری صلاحیتوں کے باوجود انھیں اس کی شکایت ہے کہ:-

"گنجفہ باز زمانہ کی بد تراشی کی وجہ سے میرے گھر کا نقشہ سیاہ خانے کا سا ہو گیا ہے۔ زمانہ ہر کور وکر کا قدر داں ہے لیکن میری روشنی طبع میری تیرہ بختی کا باعث بن گئی ہے۔"

اس کے بعد عرض حال اس طرح کرتے ہیں:-

مسافر پرورا عاجز نوازا آسماں قدرا
سدا عرض غرض شیوہ نہیں اس عبد احقر کا

اور میر عالم سے اس کے خواہش مند ہیں کہ:-

مری فکر اتنی واجب ہے کہ بس اب غیر فکر مع
نہ میل طبع گاہے سوئے زانو ہو مرے سر کا

پھر اپنے ممدوح کو وہ "فرزندانِ زہرا" کا واسطہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں آلِ پیمبر کا ہمیشہ مدح خواں رہا ہوں اور تیری مدح در اصل اولادِ حیدر کی مدح ہے۔ اس مدح کا صلہ میں وہاں بھی تیرے اجداد سے لوں گا۔ یہاں اس کے ایک مصرعہ کے بدلے ہفت کشور کا حاصل بھی مجھے قبول نہیں۔ میں ملک، کوس و طبل اور لشکر کا خواہش مند نہیں، لیکن اے حاجت روائے خلق تجھ سے میری اتنی ضرور عرض ہے:

| | |
|---|---|
| توجہ اتنی فرما تو کہ ما یحتاج کی رو سے | نہ ہو محتاج عندالوقت سیم و زر و گوہر کا |
| ادب سے دور ہے عرض مکرر لطف سے ہر چند | مزا ہے لطف کے تکرار میں قند مکرر کا |

دُعائیہ پر یہ قصیدہ ختم ہو جاتا ہے۔

## بعض معاصرین

دربار سے ہٹ کر، عوام اور خاص طور پر شعر و سخن کی محفلوں میں بھی لطف کا خاصا اثر تھا اور ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی، لطف کو دہلی سے تعلق کی بدولت اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا[1]۔ معاصر شعرا ان کا احترام کرتے تھے چنانچہ ملکا پوری کہتے ہیں، کہ اس عہد کے مشہور استاد شیر محمد خاں ایمان ان سے ملنے کے لئے گئے تھے[2]۔ ایک اور سر بر آوردہ استاد شیخ حفیظ حفیظ جو خود دہلی سے آئے تھے لطف کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ شیخ حفیظ پیشکار دیوان دکن مہاراجہ چندو لال شاداں کے

---

[1] گلزار ص ۵۰۴

[2] محبوب الزمن ج ۲ ص ۹۷۱

استاد اور ان کے دربار کے ملک الشعرا تھے۔ حیدر آباد کی شعری محفلوں پر ان کا رعب جما ہوا تھا۔ حفیظ طبع رواں کے مالک تھے چنانچہ تین دیوان ان کی یادگار ہیں۔ غزل وہ بہت اچھی کہتے تھے اور اس صنف پر انھیں استادانہ عبور حاصل تھا۔ ان کا کلام اب تک منظر عام پر نہیں آیا ہے، اس لئے ان کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جس کے وہ مستحق ہیں۔ حفیظ اپنی غزلیں اکثر لطف کو سنایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر جب انھوں نے اپنا کلام سنایا اور لطف نے اس کی قرار واقعی داد دی تو حفیظ نے اس کو اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھا اور یہ شعر کہا تھا جو پچھلے صفحات میں بھی نقل کیا جا چکا ہے:-

سنا جو لطف نے فرمایا آفریں تجھ کو

حفیظ شعر بھی کہتا ہے اور سپاہی ہے

ایک اور موقعے پر حفیظ نے شاعرانہ انداز میں لطف کی عنایات کا اعتراف اس طرح سے کیا ہے:

حفیظ الطاف ہے مرزا علی لطف کا مجھ پر

سبب یہ ہے کہ بندہ ہوں جناب شاہ مرداں کا

حیدر آباد میں لطف کے بعض معاصرین کے ساتھ معرکے بھی رہے ہیں۔ ان میں غلام مصطفےٰ خاں سخن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سخن لالہ لچھمی نارائن شفیق کے شاگرد تھے، اور شفیق ہی کی طرح، اپنے کمالات پر انھیں بھی بڑا ناز تھا، اور یہ ناز بے جا بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ ایک

زمانے کے بڑے نغز گفتار شاعروں میں سے تھے۔ غزل میں انھیں استادی کا مرتبہ حاصل تھا۔ اپنی فکر اور اپنے فن کے آگے وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ لطف اور اپنے ایک اور معاصر ذوالفقار علی خاں صفا پر انھوں نے چوٹیں کی تھیں۔ صفا بھی دہلی کے رہنے والے اور میر تقی میر کے شاگرد تھے[۱]۔ انھیں فارسی میں اچھی دستگاہ تھی۔ اردو میں وہ غزل اور مثنوی دونوں کہتے تھے۔ ان کی غزلوں کا ایک دیوان موجود ہے۔ ان کی مثنوی "چھو منتر" بہت مقبول ہوئی، چنانچہ اس کے مخطوطے اکثر کتب خانوں میں دستیاب ہو جاتے ہیں۔

لطف کے ساتھ یہ معرکے اکثر مشاعروں کی محفلوں میں ہوا کرتے تھے۔ ایک مشاعرہ کی طرحی غزل کے مقطع میں، سخن نے لطف اور صفا دونوں پر ایک ساتھ چوٹ کی ہے۔ شعر کے تیور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب سخن غزل سنا رہے تھے تو بیچ میں سے لطف اور کچھ دیر کے بعد صفا محفل سے چلے گئے۔ اس پر غالباً سخن نے فی البدیہہ مقطع کہا تھا:-

سخن کے شعر سن کر محفل ارباب معنی سے
خجل ہو لطف نکلا ایک طرف یاں سو صفا نکلا

یہ تو شاعرانہ چشمکیں تھیں، ان سے قطع نظر ان اساتذہ کے دل میں

---

[۱] گلزار آصفیہ ص ۴۶۱

ایک دوسرے کے لئے قدر و منزلت کے جو جذبات چھپے ہوئے تھے، ان کا اندازہ سخن کے اس قطعہ سے ہوتا ہے، جو انھوں نے علی لطف کی وفات پر کہا تھا۔ قطعہ آگے درج کیا جا رہا ہے۔

**وفات** لطف۔ حیدر آباد آنے کے بعد یہیں کے ہو رہے۔ ان کا قیام حیدر آباد میں کوئی سولہ سترہ برس رہا۔ اس عرصہ میں انھیں حیدر آباد سے کافی دل بستگی پیدا ہو گئی تھی جیسا کہ ان کے ذیل کے شعر سے ظاہر ہے:

ہوا آوارہ ہندوستاں سے لطف آ گے خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے

لطف کے انتقال کے سنہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ غلام حسین خاں جوہر نے، ان کی وفات ۱۲۲۸ھ ہجری میں بتائی ہے[۱]، لیکن صاحب "تذکرہ ضیغم" ۱۲۳۸ھ لکھتے ہیں[۲]۔ ضیغم کے اتباع میں عبد الجبار ملکاپوری نے بھی سنہ وفات ۱۲۳۸ ہی لکھا ہے[۳] اور دوسرے مصنفین نے اسی سنہ کا اتباع کیا ہے۔ لیکن سخن کے قطعہ کے دستیاب ہو جانے سے یہ دونوں سنہ غلط ثابت ہوتے ہیں۔ سخن کے قطعہ سے ۱۲۳۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ درج ذیل ہے:

---

[۱] گلزار آصفیہ ص ۵۰۔ [۲] مخطوطہ تذکرہ ضیغم کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو
[۳] محبوب الزمن ج ۲ ص ۹۷۲

لطفؔ صد خوبی و لطف تمام | کرد منزل ہائے ہستی را چو طے
گفت سال رحلتش پیر خرد | رفت آں اہل کمال عصر ہے[1]

۱۲۳۳ ہجری

**مذہب**

علی لطف کی زندگی اور ان کی شاعری میں جو ہم آہنگی نظر آتی ہے، اس کا ایک پرتو شاعری میں جگہ جگہ اپنے عقاید کا اظہار بھی ہے۔ وہ امامیہ مذہب کے پیرو تھے اور اپنے اعتقادات میں ایسے پختہ تھے کہ غزل، قصیدہ، مثنوی جہاں انھیں موقع ملتا ہے ایک مذہبی فریضہ کے طور پر حضرت علی اور پنجتن کی مدح سرائی کے لئے گنجایش نکال لیتے ہیں۔ حضرت علی سے انھیں ایسی بے پناہ عقیدت تھی کہ وہ آپ کی محبت کو جزو ایمان اور شرط ایمان جانتے تھے، یہی ان کی نظر میں در اصل ہندو اور مسلمان کا فرق تھا۔ کہتے ہیں:—

محبت شہ مرداں ہے شرط ایماں لطف
یہی ہے فرق مسلمان اور ہندو میں

حضرت علی کا ثانی پیدا نہ ہو سکا۔ اس خیال کو انھوں نے ایک شعر میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

چشم اور گوش زمانہ ہیں مقر اسکے لطف | ثانی حیدر کرار نہ دیکھا نہ سنا

---

۱؎ مخطوطہ دیوان سخن، مجلس تحقیقات اردو، حیدر آباد دکن۔

لطف اپنے جذبات احترام کا اظہار عموماً مقطع میں کرتے ہیں۔ مثنوی کو تو انھوں نے منقبت علی پر ہی ختم کیا ہے۔ حضرت علی کے ساتھ عقیدتمندی کا اظہار وہ جس انداز سے کرتے ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس بارگاہ میں سر کے ساتھ ان کا دل بھی احترام میں جھک جاتا ہے کہتے ہیں:

ساقیِ کوثر امامِ جزو کل | شافعِ محشر امامِ جزو کل
صاحبِ افسر شہنشاہ نجف | فاتحِ خیبر نشانِ من عرف
وارثِ منبر شہ گردوں مقام | حیدرِ صفدر سپہرِ احترام
شاہِ مرداں مردِ میدانِ وغا | شیرِ یزداں نائبِ حکمِ خدا

حضرت علی کے مراتبِ عالی کا لحاظ کرتے، وہ اس طرح مداحی کو بھی سوء ادب سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

لطف بس اب بے ادب اتنا نہ ہو | منہ تو اپنا دیکھ اور یہ گفتگو

---

## دو بھائی

لطف کا قیام حیدرآباد میں کافی عرصہ تک رہا، اس کے باوجود ان کے خاندان اور اولاد کے بارے میں کوئی معلومات تاریخوں یا تذکروں سے حاصل نہیں ہوتیں۔ غلام حسین خاں جوہر نے لطف کے حالات کے سلسلے میں، ان کے دو بھائیوں مرزا علی رضا اور مرزا جان کا سرسری طور پر تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ دونوں بھائی حیدرآباد آگئے تھے اور یہاں سوزخواں کی حیثیت سے

شہرت رکھتے تھے۔ لیکن مجھے مرزا علی رضا کے بارے میں کچھ مزید معلومات بعض قدیم بیاضوں اور کلام کے مجموعوں سے حاصل ہوئی ہیں۔

علی رضا فارسی اور اردو کے اچھے شاعر بھی تھے اور رضا تخلص کرتے تھے، غزل، قصیدہ، مرثیہ، نوحہ، رباعی غرض سب ہی اصناف میں ان کا کلام مل جاتا ہے۔ وہ بھی ارسطو جاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ چنانچہ ان کی مدح میں رضا کے دو اردو قصیدے، ایک فارسی قصیدہ اور تین فارسی قطعے دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ قصائد اور قطعات مخطوطہ "مجموعہ فصاحت" میں شامل ہیں، اس مجموعہ کی کچھ تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔

رضا کے قصیدوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس صنف میں اچھی دست رس حاصل تھی۔ تاہم انھیں اس فن میں لطف یا ارسطو جاہ کے بعض دوسرے بلند پایہ مدح نگاروں کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے ایک قصیدہ کے دو شعر ہیں:

ہے بجا وصف جو کروں تحریر	فیض بخش جہاں کرم تخمیر
علم و حکمت، فراست و تدبیر	سیکھ جائے یہاں ارسطو بھی

یہی انداز ان کے دوسرے قصیدوں کا بھی ہے۔ لیکن غزل وہ قصیدے کے مقابلے میں زیادہ بہتر کہتے تھے۔ ان کی کچھ غزلیں قدیم بیاضوں میں مندرج مل جاتی ہیں۔ غزل میں ان کا انداز منجھا ہوا ہے، زبان وہ صاف ستھری لکھتے ہیں اور ان کے اسلوب میں بھی ایک

لوچ ہے۔ ان کی غزل کا انداز عام طور پر ابتدائی دور کے غزل گو شعرا سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ہیں:

ہم آپ پریشاں ہیں دلبر کا خدا حافظ — دل زلف میں جا الجھا اب دل کا خدا حافظ

بازار محبت میں اے سیم تناں تم سے — زردار کا سودا ہے بے زر کا خدا حافظ

اس ہجر کی آتش سے کہتا ہے رضا جل کر — دنیا میں تو گزری ہے محشر کا خدا حافظ[1]

---

ذیل میں ایک اور غزل کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:۔

مرے جگر میں رہے گی خلش قیامت تک — وہ بے وفا سے مجھے آشنا نہ ہونا تھا

میں بیوفا جو کہوں یار کو سو بیجا ہے — مرے نصیب میں یہ مدعا نہ ہونا تھا

جو تھا سو قطع ہوا جلد رشتۂ امید — یہ ابتدا کو مری انتہا نہ ہوتا تھا

نیاز و عجز نے میرے اسے کیا سرکش — جو کچھ کہ تجھ سے ہوا اے رضا نہ ہونا تھا[2]

رضا کی کچھ رباعیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رضا رباعی کے مزاج سے بھی فی الجملہ نا آشنا نہیں تھے۔ اخلاق و حکمت اور کائناتی حقائق جو رباعی کا خاص موضوع رہے ہیں رضا کی رباعیوں میں بھی نمایاں ہیں۔ ذیل میں ان کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے:۔

---

[1] مخطوطہ بیاض ۳ کتب خانہ سالار جنگ

[2] " " ۱۶۶

جس دل کو قلق نے آہ گھیرا ہوگا ‏ آنکھوں میں پھرا اسکی خلق اندھیرا ہوگا
کیوں گرد سے دامن کو بچاتا ہے رضا ‏ اس خاک پر آخرش بسیرا ہوگا[1]

رضا نے نوحے بھی لکھے تھے، لیکن عام طور پر اب یہ نوحے دستیاب نہیں ہوتے۔ ایک قدیم بیاض میں ان کا نوحہ مندرج ملتا ہے۔ اس کے کچھ شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

آج شبیر کا اے اہل عزا چہلم ہے
روتے ہیں حور و ملک ارض و سما چہلم ہے
مضطرب ہو کے نہ کیوں خاک پہ غم سے لوٹیں
رخصت صبر و تحمل ہے، رضا چہلم ہے[2]

مرزا علی رضا، لطف سے، نو دس برس پہلے حیدر آباد آچکے تھے۔ لیکن وہ واقعتاً کس سنہ میں یہاں آئے اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ارسطو جاہ کی مدح میں انھوں نے جو تاریخی قطعے لکھے تھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۰۳ھ سے قبل حیدر آباد آچکے تھے۔ ارسطو جاہ کے محل میں ایک حوض کی تعمیر کے موقع پر رضا نے حسب ذیل قطعہ کہا تھا:

آستان رفیع و حوض وسیع ‏ کرد بنیاد ذات با برکات
خضر فرمود سال تاریخش ‏ بے شبہ ایں نشان آب حیات[3]

۱۲۰۳ھ

---

[1] مخطوطہ بیاض ۲۸ کتب خانہ سالار جنگ
[2] بیاض ۵۶ مراثی ″ ″
[3] مخطوطہ مجموعہ فصاحت ″ ″

حیدرآباد آنے کے بعد، رعنا بھی جلد ہی ارسطو جاہ کے دربار سے متوسل ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں جو انھوں نے ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا ہے، اپنے قدیمی توسل کی طرف اس طرح سے اشارہ کرتے ہیں:

ہوں میں حضرت کا مدح خوان قدیم  جانتے ہیں سبھی امیر و غریب

ایک اور قصیدہ میں بھی اس بات کا اعادہ وہ اس طرح کرتے ہیں:

قدامت اور غلامی میں نہیں تیرے مقابل کوئی
دکن سے ہند تک مشہور ہے تیری ثنا خوانی

اس شعر میں انھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ انھیں ارسطو جاہ کے مدح نگار کی حیثیت سے شہرت بھی حاصل ہو چکی ہے اور یہ دعوےٰ بے بنیاد بھی نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ منشی کریم الدین کے حد علم تک وہ ارسطو جاہ کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدہ کے توسط ہی سے پہنچے تھے۔ رعنا کے یہ دو شعر منشی کریم الدین نے نقل کئے ہیں:

ہیں کہاں ایسے بے عدیل و نظیر  رائے جن کی ہو وافق تقدیر
سیکھ جاوے یہاں ارسطو بھی  علم و حکمت فراست و تدبیر

دوسرے شعر میں "ارسطو" کا لفظ موجود ہے، تاہم منشی کریم الدین اس سے واقف نہیں تھے کہ یہ ارسطو جاہ کی طرف اشارہ ہے، ایک خاص بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ منشی کریم الدین انھیں دکن میں قیام کی وجہ سے دکنی تصور کرتے تھے۔[1]

---

[1] طبقات الشعرائے ہند ص ۲۶۴۔

علی رضا پر ارسطو جاہ کے بڑے الطاف تھے، اور ان کے قصیدوں کو پڑھنے سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ارسطو جاہ کی قدردانیوں اور عنایات نے رضا کے حوصلے بہت بڑھا دئے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک قصیدہ میں یہ ادعا کرتے ہوئے کہ میں آپ سے "کچھ زیادہ طلب نہیں رکھتا" اور "گوہر و لعل و سیم و گنج خطیر" کی مجھے تمنا نہیں، وہ ایک سانس میں ارسطو جاہ سے خدمت، پالکی، جاگیر، غرض سبھی کچھ مانگ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

ہے یہ مقصد مرا سو بر آوے — خدمت و پالکی مع جاگیر

رضا پالکی کی خواہش کیوں کرتے ہیں، اس کی بھی ایک دلچسپ وجہ ہے۔

تا رضا پالکی پہ ہو کے سوار — کرے دیوان مدح میں تسطیر

رضا کا یہ قصیدہ بہت مشہور ہوا اور شمالی ہند تک اس کے اشعار پہنچے چنانچہ اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکرہ "عمدہ منتخبہ" میں اسی قصیدہ کا اقتباس دیا ہے، لیکن وہ ان کا نام محمد رضا بتاتے ہیں[1]۔

علی لطف کے حیدر آباد آنے کے محرکات میں سے ایک خود ان کے بھائی علی رضا بھی تھے، جن کے توسط سے ارسطو جاہ کی قدردانیوں کے واقعات ان تک پہنچتے رہتے تھے۔

علی رضا بھی غالباً حیدر آباد ہی میں پیوند زمیں ہوئے۔

---

[1] عمدہ منتخبہ ص ۲۸۴-۲۸۵

ان کے انتقال کا سنہ کسی تذکرہ یا تاریخ میں درج نہیں ملتا۔ لیکن "گلزارِ آصفیہ" کے مصنف نے جس انداز سے ان کا ذکر کیا ہے، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ، رضا کا انتقال "گلزارِ آصفیہ" کی تدوین کے سنہ ۱۲۶۰ھ تک ہو چکا تھا۔[1] علی رضا نے اپنے کلام کا کوئی مجموعہ مرتب کیا تھا، یا نہیں، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ارسطو جاہ کی مدح میں لکھے ہوئے ان کے دو اردو قصیدے ایک فارسی قصیدہ اور تین فارسی قطعات جو "مجموعہ فصاحت" میں شامل ہیں انسے ظاہر ہے کہ رضا کے کلام کے اجزا ایک جا نہیں ملتے، بلکہ بیاضوں میں منتشر ہیں۔

علی لطف کے دوسرے بھائی، مرزا جان کے بارے میں ہماری معلومات بہت تشنہ ہیں۔ غلام حسین خاں جوہر نے ان کی طرف جو ایک چلتا سا اشارہ کر دیا ہے، اس کے علاوہ ان کا ذکر کسی اور تذکرہ یا تاریخ میں نہیں ملتا۔ جوہر کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی حیدرآباد میں سوز خواں کی حیثیت سے مشہور تھے۔ وہ حاجی بھی تھے۔ ان کا بھی انتقال ۱۲۶۰ھ تک ہو چکا تھا اور وہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔[2]

---

[1] گلزارِ آصفیہ ص ۵۰۰

[2] ایضاً ایضاً

# (۲) کارنامے

## گلشن ہند

مرزا علی لطف تذکرہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ متنوع صلاحیتوں کے حامل تھے، چنانچہ وہ ایک اچھے غزل گو شاعر تھے، اس کے علاوہ انھوں نے کئی قصیدے اور ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔ ایک بات ضرور ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی ادبی اور فکری صلاحیتیں ان کے دو کارناموں میں خاص طور سے اجاگر ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ان کا تذکرہ "گلشن ہند" ہے، جو شائع ہو چکا ہے، اور دوسری ان کی مثنوی جو اب منظر عام پر آئی ہے۔

"گلشن ہند" اردو شعرا کے اہم ابتدائی تذکروں میں سے ہے، کیونکہ اس کی ترتیب سے پہلے صرف چند ہی تذکرے لکھے گئے تھے مثلاً:۔

(۱) نکات الشعرا (۱۱۶۴ھ) میر تقی میر

(۲) گلشن گفتار (۱۱۶۵ھ) خواجہ حمید خاں اورنگ آبادی

(۳) تذکرہ ریختہ گویاں (۱۱۶۵ھ) گردیزی

(۴) تحفۃ الشعرا ( ۱۱۶۵ھ ) افضل بیگ قاقشاں

(۵) مخزن نکات ( ۱۱۶۸ھ ) قائم چاندپوری

(۶) ریاض حسنی ( ۱۱۶۸ھ ) خواجہ عنایت اللہ خاں فتوت

(۷) چمنستان شعرا ( ۱۱۷۵ھ ) لالہ لچھمی نارائن شفیق

(۸) تذکرہ شعرائے اردو (۱۱۸۸-۱۱۹۲ھ) میر غلام حسن حسن

(۹) تذکرہ شورش ( ۱۱۹۳ھ ) سید غلام حسین شورش

(۱۰) گلزار ابراہیم ( ۱۱۹۹ھ[۱] ) علی ابراہیم خاں خلیل

---

۱؎ "گلزار ابراہیم" کی ترتیب کے سنہ کے بارے میں ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ مختلف مصنفین نے اس کے مختلف سنین دیے ہیں۔ خود لطف کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خلیل نے ۱۱۸۶ھ میں اسے شروع کیا تھا اور ۱۱۹۸ھ میں یہ اختتام کو پہنچا (گلشن ہند دیباچہ ص ۲)۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمہ میں لطف ہی کی عبارت کو دہرا دیا ہے اور اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا (گلشن ہند، مقدمہ ص ۲) مطبوعہ تذکرہ "گلزار ابراہیم" شائع کردہ انجمن ترقی اردو کے مقدمہ میں مرتب نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ۱۱۹۸ھ کے بعد بھی خلیل نے اس میں اضافے کئے تھے۔ لیکن انھوں نے یہ پتہ چلانے کی کوشش نہیں کی کہ یہ اضافے کس سنہ تک ہوئے ہیں۔ تذکرے کے مطالعے کے دوران میں مجھے جو آخری واقعہ اس میں مندرج دستیاب ہوا ہے وہ ۱۱۹۹ھ کا ہے۔ علی ابراہیم نے لکھا ہے کہ میری ملاقات ۱۱۹۹ھ میں مغموم سے

(۱۱) تذکرہ ہندی (۱۲۰۹ھ) غلام ہمدانی مصحفی

مذکورۂ بالا فہرست کے مدنظر لطف کا تذکرہ "گلشن ہند" تقریباً بارھواں قرار پاتا ہے۔

"گلشن ہند" سے پہلے جو تذکرے لکھے گئے تھے' ان میں حالات سے زیادہ عموماً عبارت آرائی پر زورِ قلم صرف کیا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی میں بھی تذکرہ نگار خاص طور پر کاوش اور جستجو سے کام لینا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے ملنے جلنے والوں اور احباب کے حالات میں خاطرِ احباب زیادہ ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ یہ بات پرانی اخلاقی قدروں کے عین مطابق بھی تھی۔ اگر کسی کی کچھ کوتاہی نظر میں آتی بھی تو چشم پوشی سے کام لینے کو مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ اصل میں تذکرہ کے سوانحی پہلو پر زور دینا تذکرہ نگار کا مقصد ہوتا ہی نہیں تھا۔ تذکرہ میں' جس کا آغاز بیاض اور سفینہ سے ہوا تھا کلام ہی کی ساری اہمیت تھی اور شاعر کے نام' تخلص اور وطن کے بارے میں یادداشت کے طور پر

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بنارس ہی میں ہوئی۔ خلیل بنارس میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ (گلزارِ ابراہیم ص ۲۴۰) اسی کے مدنظر میں نے گلزارِ ابراہیم کا سنہ ۱۱۹۹ھ درج کیا ہے۔ طفیل احمد مرتب "یادگارِ شعرا" نے جہاں تذکروں کی فہرست دی ہے "گلزارِ ابراہیم" کا سنہ پتہ نہیں کس بنیاد پر ۹۶-۱۱۹۵ھ لکھ دیا ہے۔ (یادگارِ شعرا ص ۶)

ایک دو جملے لکھ دینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ اگر کبھی کسی تذکرہ نگار نے کچھ اُپج سے کام لیا، تو شاعر کے کلام کے بارے میں کوئی توصیفی اشارہ کر دیا اور بس۔ میر تقی میر کے تذکرہ "نکات الشعرا" کے بارے میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ انھوں نے شعری معیاروں کا زیادہ لحاظ دکھایا ہے، لیکن ہمارے عصر کا حقیقت پسند نقاد، ان کے تذکرے میں بھی سخت قسم کی جانب داری کے پہلو تلاش کرنے پر مصر ہے اور انھیں تلاش کر رہا ہے۔

**کچھ امتیازات**

"گلشن ہند" سے قبل کے تذکروں کو پڑھنے کے بعد جب ہم اس تذکرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو یہ کئی اعتبارات سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تذکرہ دوسرے تذکروں بلکہ خود اپنے نقش اول "گلزار ابراہیم" کے مقابلے میں بھی زیادہ تفصیلات پر حاوی ہے۔ تذکرے میں سب سے اہم جز ظاہر ہے کہ سوانحی ہوتا ہے، اگر تذکرہ میں اس جز کی کمی ہے، تو ہر چیز کی کمی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ "گلشن ہند" "گلزار ابراہیم" پر مبنی ہے، لیکن لطف نے بھی اس میں بہت سے مفید اضافے کیے ہیں۔ ان میں کئی اضافے ایسے بھی ہیں، جو خود ان کی شخصی معلومات کا نتیجہ ہیں۔ یہ تفصیلات ہم کو کسی اور ماخذ سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ اس سلسلے میں خاص طور پر میر کے بارے میں کئی باتیں ایسی ہیں، جو صرف اسی تذکرے میں ملتی ہیں، مثلاً یہ واقعہ کہ میر کو بھی

کلکتہ کی ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ کے ریذیڈنٹ نے ملاقات کے لئے بلوایا تھا مگر پیرانہ سالی کی وجہ سے ان کا انتخاب نہ ہوسکا، معاصرانہ بیان کی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ میر کی مثنوی "دریائے عشق" کی شہرت کا انھوں نے جو تذکرہ کیا ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی میر کی زندگی ہی میں کافی مقبول ہوگئی تھی۔ اپنے ایک معاصر مرزا غلام حیدر مجذوب کے بیان میں لطف نے ان کے دو دواوین کا ذکر کیا ہے۔ لطف کا ایک اور اہم بیان انشا سے تعلق رکھتا ہے۔ انشا نے تذکرہ "گلشن ہند" کی ترتیب سے ایک سال پہلے نواب عماد الملک کی مدح میں ایک غیر منقوط قصیدہ لکھا تھا۔ اس قصیدے کا ذکر کرنے کے بعد لطف نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اس قصیدے کی بڑی تعریف ہوئی اور انشا کو اس کا بیش بہا صلہ عطا کیا گیا۔

ایک اور اہم شاعر، شاہ ولی اللہ اشتیاق کے بارے میں علی ابراہیم نے یہ لکھا تھا کہ ان کے جد شاہ محمد گل تھے۔ لطف نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر اس اطلاع کو غلط بتایا ہے۔[1] شیر علی افسوس سے لطف کے جو گہرے تعلقات رہ چکے تھے، اس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ ان کے اسلاف اور خاندان کے بارے میں بھی لطف نے بہت سی نئی

---

[1] گلشن ہند ص ۳۲۔

تفصیلات فراہم کی ہیں۔ لکھا ہے کہ افسوس گیارہ برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ آئے تھے۔ افسوس کے والد کے بارے میں بھی کچھ معلومات اسی درج کی ہیں، جو کسی اور ماخذ سے دستیاب نہیں ہوتیں، مثلاً یہ کہ وہ حیدرآباد آگئے تھے، اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت افسوس کی عمر انیس برس کی تھی[1]۔

حکیم رضا قلی خاں آشفتہ، شاعر کے علاوہ، اپنے زمانے کے مشہور طبیب بھی تھے۔ لطف کے ان سے بھی گہرے مراسم تھے، اسی لئے ان کے حالات بھی لطف نے کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔ آشفتہ کو سوز سے تلمذ تھا۔ لطف نے آشفتہ کی مخصوص افتادِ طبع، ان کی شاہ خرچی کی عادت اور حسن پرستی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بنگالہ کے قیام کے زمانے میں انھوں نے کوئی ایک لاکھ کے قریب روپیہ پیدا کیا تھا لیکن جب وہ مرشدآباد سے نکلے تو ایک حبہ بھی ہاتھ میں نہیں تھا، بلکہ الٹے مقروض تھے[2]۔

مرزا رفیع سودا، جب لکھنؤ پہنچے، تو لطف وہیں تھے۔ سودا کے لکھنؤ میں قیام اور آصف الدولہ کے دربار سے ان کے توسل کے سلسلے میں لطف نے جو تفصیلات درج کی ہیں، وہ بھی معاصرانہ اطلاعات کی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ سودا کو آصف الدولہ کی

---

۱-۲ گلشن ہند ص ۴۸، ۴۸-۴۹

سرکار سے چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ ان کا انتقال لطف کے لکھنؤ میں قیام کے زمانے ہی میں ہوا[1]

محمد بقا کے حالات میں لطف نے یہ لکھا ہے کہ وہ اکثر سودا کے منہ آیا کرتے تھے، لیکن سودا، ان کے خلاف کچھ کہنے کو اپنے مرتبے سے فروتر جان کر، خاموش رہ جاتے تھے[2]

مرزا عبدالقادر بیدل کے حالات میں بھی علی لطف نے بہت تفصیل سے کام لیا ہے، خاص طور پر ان کی تنومندی اور بہادری کے سلسلے میں جو باتیں بیان کی ہیں، ان سے بیدل کو بحیثیت انسان سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ایک دفعہ شکار کے موقع پر وہ شہزادہ اعظم شاہ کے ہمراہ تھے۔ دفعتاً سامنے ایک شیر آ گیا۔ بیدل نے اس پر ایسا وار کیا کہ وہ لطف کے الفاظ میں بکری کی طرح مارا گیا۔ آخری عمر میں بیدل نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی، ان کے زمانے کے امرا نہ صرف ان کے قدردان بلکہ ان کے معتقد بھی تھے، چنانچہ نظام الملک آصف جاہ اول نے انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی تھی، لیکن بیدل نہیں گئے، اور طلبی کے خط کے جواب میں اپنا ایک شعر لکھ کر روانہ کر دیا، جو بہت مشہور ہوا:

دنیا اگر دہند نہ جنبم زجائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش[3]

---

[1] گلشن ہند ص ۱۰۴ [2] گلشن ہند ص ۵۸ [3] گلشن ہند ص ۵۴

علی ابراہیم خاں خلیل نے محمد یار خاکسار کا حال لکھتے ہوئے ان کے کلام سے کچھ نمونہ نہیں دیا تھا اور صرف یہ لکھ دیا تھا کہ ان کے اشعار مجھے دستیاب نہیں ہو سکے۔ لطف نے خاکسار کی غزلوں کے ۹ شعر نقل کئے ہیں[1]۔

میر حسن کے انتقال کا جو سنہ مطبوعہ تذکرہ میں درج ہے، اگر اس پر اعتبار کیا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ علی لطف سے غلطی ہو گئی ہے۔ تذکرہ میں میر حسن کے انتقال کا سنہ ۱۲۰۵ھ لکھا ہے۔ "گلشن ہند" کی عبارت حسب ذیل ہے:—

"بے نظیر اور بدر منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے اور سنہ ۱۲۰۵ھ میں سیر روضۂ رضواں کی کی ہے"[2]

لیکن مصحفی نے "تذکرہ ہندی" میں ان کے انتقال کا سنہ ۱۲۰۱ھ لکھا ہے۔ اور یہ سنہ قابل اعتماد بھی ہے، کیونکہ مصحفی نے ان کے انتقال پر قطعہ تاریخ کہا تھا جس میں "شاعر شیریں زبان" سے سنہ ۱۲۰۱ھ برآمد کیا ہے[3]۔

گولکنڈہ کے حکمران، ابو الحسن تانا شاہ کے حالات میں لطف نے کئی ایسی باتیں لکھی ہیں، جن سے اس پادشاہ کے مزاج کی مخصوص افتاد کا

---

[1] گلشن ہند ص ۵۷ [2] گلشن ہند ص ۹۲

[3] تذکرہ ہندی ص ۶۸ - ۶۹۔

اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک خاص بات یہ کہ تاناشاہ کو حقّے کا بہت شوق تھا اور حقّے میں وہ گلاب بھرواکر پیتے تھے اور نیچہ بید مشک میں تر کیا جاتا تھا۔ اس سے گلاب اور بید مشک کے سینکڑوں شیشے روزانہ صرف ہوتے تھے۔ عالمگیر نے اسے اسراف جانا اور اس معمول میں کمی کرتے کرتے، آخر کار بالکل موقوف کر دیا۔ لطف لکھتے ہیں کہ اس موقع پر تاناشاہ نے عالمگیر کو کہلا بھیجا کہ "جہاں پناہ کی دولت سے اتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہے کہ دس چلمیں، روز اسی خرچ کے ساتھ سالہائے سال پلا سکتا ہے"[1]

عبدالحی تاباں کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ وہ ایک لڑکے پر عاشق تھے۔ اس لڑکے نے آخری عمر میں درویشی اختیار کر لی تھی اور کبر سنی میں لکھنؤ آ گیا تھا۔ لطف نے اسے لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے بال سفید ہو چکے تھے اور قد خمیدہ ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود لطف کے بیان کے مطابق 'حسن کے مٹے مٹے سے نقوش اس میں باقی تھے'[2]

جرأت کو بھی لطف نے بہت قریب سے دیکھا تھا، چنانچہ ان کی ستار نوازی اور علم نجوم میں مہارت کا بطور خاص ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ علم نجوم میں لوگ ان کے احکام کے منتظر رہتے تھے۔ محمد حسین آزاد کے

---

[1] گلشن ہند ص ۶۶ [2] گلشن ہند ص ۶۸

بیان کے انداز سے، جرأت کے اندھے ہونے کے بارے میں شبہات پیدا ہو گئے تھے، لیکن لطف لکھتے ہیں کہ وہ بصارتِ چشم سے معذور ہونے کے باوجود، مخلص دوستوں کی ملاقات کے لئے دور دور جاتے تھے۔[1]

میر شمس الدین فقیر کے بارے میں لطف نے لکھا ہے کہ انھوں نے دکن کا سفر کیا تھا۔[2] قائم اور مخلص کے سنہ وفات کا اندازہ بھی انھوں نے بتایا ہے[3] اور شاہ قدرت اللہ دہلوی کی تاریخ وفات بھی درج کی ہے۔[4] اکثر شعرا کے حالات میں سنین کے اندراج کا لطف نے حتی الامکان خیال رکھا ہے۔

لطف نے اپنے زمانے کی اہم تاریخی شخصیتوں، جیسے شاہ عالم آفتاب، آصف الدولہ، قزلباش خاں امید، امیر خاں انجام وغیرہ کے حالات کو اس زمانے کے تاریخی واقعات کے چوکھٹے کے اندر بٹھا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جو تذکرہ نگاری میں ایک خوش آئند اضافہ ہے۔

"گلشن ہند" کا ادبی پہلو بھی، اس کے سوانحی اور تاریخی پہلو سے کم اہم نہیں ہے۔ اس بات کا لحاظ کرتے کہ یہ اردو میں لکھے ہوئے اولین تذکروں میں سے ہے، اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اردو شعرا کے جو تذکرے فارسی میں لکھے گئے ہیں، ان کی ظاہر ہے کہ

---

[1] گلشن ہند ص ۷۲
[2] گلشن ہند ص ۱۲۹
[3] ایضاً ص ۱۳۴ و ۱۶۲
[4] ایضاً ص ۱۳۸

ہمارے لئے کوئی ادبی اہمیت نہیں۔ "گلشنِ ہند" پہلا تذکرہ ہے، جو شعرا کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے علاوہ، ادبی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ لطف کا یہ بیان پچھلے صفحات میں نقل کیا جا چکا ہے کہ یہ تذکرہ گلکرسٹ نے نووارد انگریزوں کو اردو سکھانے اور ان میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے مقصد سے لکھوایا تھا۔ اس لحاظ سے، اس کا سلیس اور سادہ زبان میں لکھا جانا ضروری تھا، چنانچہ لطف نے حتی الامکان اس کی نگہداشت ملحوظ رکھی ہے۔ اس کے باوجود، تاریخی جبریت کے اس اثر سے وہ بچ نہیں سکے، کہ ان کے ذوق کی پرورش فارسی کے ادبی اسلوب اور لکھنو کی مرصع نگاری کے ماحول میں ہوئی تھی۔ مرصع نگاری کا جو ذوق انھوں نے ماحول سے پایا تھا، اسے وہ پوری طرح ترک نہیں کر پائے، چنانچہ اکثر جگہ عبارتوں میں قافیہ اور سجع کی رعایت آجاتی ہے۔ لیکن ایک سلیقہ کے ساتھ اور ایسی کہ پڑھنے والوں کی طبیعت پر گراں گزرے۔ ان کی عبارتوں میں کہیں کہیں تکلف کا شائبہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور لطف کے لئے یہ ایک فطری بات تھی، کیونکہ لکھنو کے مذاق کے اثر سے وہ بالکلیہ اپنا دامن بچا نہیں سکتے تھے۔ "گلشنِ ہند" کی زبان کے سلسلے میں ایک بات جو خاص طور پر جاذبِ توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں بعض قدیم، متروک اور نامانوس نحوی یا صرفی روپ آگئے ہیں۔ اس طرح کے روپ شمالی ہند میں اردو شاعری کی زبان میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ میں اس طرح کے کچھ

نمونے پیش کئے ہیں۔ "گلشن ہند" کے لکھے جانے سے بہت پہلے اردو شاعری کا ارتقا شمالی ہند میں بھی عمل میں آنے لگا تھا، جس کے نتیجے کے طور پر شعری سانچے متعین ہو گئے تھے اور شاعری کی زبان منجھ گئی تھی۔ اس عمل ارتقا کے نتیجہ کے طور پر بہت سے قدیم روپ متروک ہو چکے تھے، لیکن نثر کی یہ صورت نہیں تھی۔ نثر ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور اپنی نشو و نما کے لئے ایک طرف تو اسالیب کی حد تک، وہ فارسی اور عربی کے سہارے ابھرنے کی کوشش کر رہی تھی، دوسری طرف زبان اور اظہار کے اسالیب میں، اس کے سامنے دکن کے نثری کارناموں کے نمونے تھے، جن میں قدیم الفاظ، تصریفیں اور نحوی روپ بندھ بندھا کر مستند سے ہو گئے تھے۔ یہ روپ شمال کے نثری کارناموں میں پھر عود کر آتے ہیں۔ مثلاً الفاظ کے قدیم اور دکنی روپ "توں"، "کوں"۔ فضلی کی "کربل کتھا"، افسوس کی "باغ اردو"، سرور کی "فسانہ عجائب"، انشا کی "رانی کیتکی"، سب میں ملتے ہیں۔ مثلاً:

"فرزند اپنے کوں قربان کیا توں نے" (کربل کتھا ص ۳۶)

ضمیر واحد متکلم میں اضافی کی جگہ محض فاعلی روپ کا استعمال جیسے:

"وابستہ ترے لطف کی مجھ مُشت خاک ہے۔" (کربل کتھا ص ۳۳)

فعل معطوف کی ذیل کی صورت:

"حضور میں باریاب کرا امتیاز دیا۔ (کربل کتھا ص ۳۱)

نحوی آثار میں ایسے جملے جو قدیم اردو اور دکنی کے مطابق راست

ساخت (Direct construction) کے حامل ہیں، اور جن میں "نے" علامت فاعل نہیں ہے اور فعل کی مطابقت فاعل سے ہے:

"تب آپ زبان اعجاز بیان سے فرماے" (کربل کتھا ص ۳۰)

"اں" کے ساتھ جمع قدیم اردو اور دکھنی کی عام خصوصیت ہے، شیر علی افسوس نے بھی "باغ اردو" میں اس طرح کی جمع استعمال کی ہے:

"ایک شخص کو درویشوں کی صورت کے موافق اور ان کی سیرت کے مخالف کسی مجلس میں دیکھا میں نے کہ بدیاں کر رہا ہے۔ (باغ اردو)

صفت عددی ترتیبی کی ایک خاص صورت جو رجب علی بیگ سرور نے "فسانہ عجائب" میں ایک مقام پر استعمال کی ہے، وہ بھی قابل دید ہے:

"تنور فلک جارم کی چھاتی سرد تھی" (فسانہ عجائب)

سید صالح محمد دہلوی نے "اتالیق الصبیان" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جس میں انھوں نے فعل معطوفہ کا ایسا روپ استعمال کیا ہے، جو قدیم اردو اور دکن کے شاعروں اور ادیبوں کے یہاں عام ہے۔ اس کے علاوہ صفت مقلوب کا استعمال بھی قابل ملاحظہ ہے:

"مسائل ضروری نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ کے کتابوں معتبر سے چن کر اور مختصر کر کر۔۔۔ لکھے"

ایک سے ایک جوبن میں اگلی جھولا ڈالے ہوئے پڑی جھول رہی ہیں"۔

(داستان رانی کیتکی)

"اگلی" کا استعمال بھی قابل لحاظ ہے جو دکھنی میں عام ہے۔

**مطبوعہ تذکرہ مکمل نہیں ہے**

مطبوعہ تذکرہ کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تذکرہ بعض اعتبارات سے مکمل نہیں ہے۔ اصل مخطوطے کے مقابلے میں مرتب نے اکثر شعرا کے کلام میں حذف و اسقاط سے کام لیا ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ "گلشن ہند" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:—

"مولف نے شعرا کا جو کلام بطور انتخاب کے درج کیا ہے، اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں، ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے۔ صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں۔ مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا، ان کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے دیا ہے[1]"۔

خود لطف کے کلام میں بھی کافی کاٹ چھانٹ کی گئی ہے۔ اس کا پتہ بھی ہم کو مولوی صاحب کے مقدمہ سے چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لطف نے:—

اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دیئے تھے۔ اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا ہے[2]"۔

---

۱۔۲ گلشن ہند ص ۲۴۔

اس بحث کا یہاں محل نہیں کہ اس طرح کی کاٹ چھانٹ کرنے میں مرتب حق بجانب تھے یا نہیں۔ مولوی صاحب مرحوم کے اوپر کے بیان سے بھی یہ واضح نہیں ہے کہ "صفحہ کے صفحے" جو "رنگ دے گئے تھے" وہ مکمل دیوان پر مشتمل تھے، یا انتخاب تھا۔ لیکن دتاسی نے لکھا ہے کہ "گلشن ہند" میں لطف کی ساری غزلیں شامل تھیں۔ دتاسی کے خطبہ کا اقتباس حسب ذیل ہے :-

"خود مولف تذکرہ کے حالات کے بعد اس کی غزلیات کا پورا دیوان درج ہے۔[1]

ان دونوں بیانات کے مقابلے میں ہمارے سامنے ایک اور بیان منشی کریم الدین کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لطف کا کلام بہت تھا جس میں سے انھوں نے اپنے تذکرے میں (۷۲) صفحات کا انتخاب دیا تھا۔ اس میں غزلیات کے علاوہ ان کی مثنوی اور قصیدے بھی شامل تھے۔ کریم الدین کی عبارت حسب ذیل ہے :-

"لطف کے بہت شعر ہیں اور اس نے اپنے تذکرہ میں اپنے اشعار میں سے (۷۲) صفحے منتخب کئے ہیں، جن میں غزلیات، قصیدہ اور ایک عشق کی مثنوی ہے۔[2]"

---

[1] خطبات گارساں دتاسی ص ۳۰۔ [2] طبقات الشعرائے ہند ص ۳۱۷۔

دتاسی اور منشی کریم الدین کے بیانات میں جو تضاد ہے وہ ظاہر ہے۔ تاہم ایک بات دونوں کی تحریروں میں جو مشترک ہے وہ یہ ہے کہ دونوں لطف کے (۷۲-۷۳) صفحوں کے کلام کا ذکر کرتے ہیں۔ دتاسی کے کتب خانے میں لطف کے کلام کا جو مخطوطہ موجود تھا، اس کی تفصیل انھوں نے اپنے ۱۸۵۷ء کے خطبہ میں یہ بتائی ہے کہ اس میں غزلوں کا حصہ (۳۱) صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ میں (۱۷) سطریں (ابیات) ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں (۱۷) صفحے قصائد کے اور (۲۵) صفحے مثنویوں کے ہیں۔ خطبہ سے اقتباس حسب ذیل ہے:

> "مولف تذکرہ کے حالات کے بعد، اس کی غزلیات کا پورا دیوان درج ہے، جو میرے قلمی نسخے میں (۱۷) سطروں کے (۳۱) صفحوں پر ہے، اور اس کے علاوہ (۱۷) صفحوں پر قصیدے اور (۲۵) صفحوں پر عشقیہ مثنویاں ہیں۔ سب ملا کر (۷۳) صفحے ہوتے ہیں[1]۔"

دتاسی کے بتائے ہوئے حساب سے، ان کے نسخے کے ابیات کی جملہ تعداد (۱۲۶۱) ہوتی ہے، جو ان کے بیان کے مطابق لطف کا پورا کلام ہے۔ منشی کریم الدین نے لطف کے تذکرہ میں شامل کئے ہوئے کلام کے (۷۲) صفحے بتائے ہیں۔ تاہم ان کا بیان دتاسی جیسا واضح نہیں

---

[1] خطبات گارساں دتاسی ص ۸۳-۸۴

جس سے ابیات کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ اسے کریم الدین لطف کے کلام کا انتخاب لکھتے ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد میں لطف کے کلام کا جو مخطوطہ محفوظ ہے وہ بھی (۷۲) صفحات پر مشتمل ہے لیکن اس میں مثنوی شامل نہیں ہے۔ مجلس تحقیقات اردو، حیدرآباد دکن کے کتب خانہ میں لطف کے دیوان اور مثنوی کے جو مخطوطات محفوظ ہیں، ان کے اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً پونے بارہ سو ہوتی ہے۔ اس میں دتاسی کے مخطوطے کے مقابلے میں سو ابیات کم ہیں۔ مجھے تلاش سے بعض تذکروں اور بیاضوں میں لطف کی غزلوں کے کچھ شعر اضافہ بھی ملے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرے پیش نظر جو مخطوطے ہیں ان میں لطف کی پوری غزلیں شامل نہیں ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے مخطوطے میں واضح طور پر "دیوان منتخب مرزا علیجان" درج ہے۔ تاہم دتاسی کے اس بیان پر مجھے شبہ ہے کہ اس کے نسخے میں (۲۵) صفحات پر مشتمل "مثنویاں" تھیں۔ کیونکہ لطف کے معاصر تذکرہ نگار مصحفی اور منشی کریم الدین دونوں نے ان کی صرف ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے میری تلاش سے بھی ان کی صرف ایک مثنوی "نیرنگ عشق" دستیاب ہوئی ہے۔ اس کے سارے نسخوں کے مقابلے اور چھان بین کے بعد اشعار کی جملہ تعداد (۴۰۱) سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اشعار کی یہ تعداد دتاسی کے بتائے ہوئے حساب کے لگ بھگ ہوتی ہے چنانچہ دتاسی کے نسخے میں (۲۵) صفحات کی جو مثنوی درج تھی، اس کی ابیات کی تعداد فی صفحہ (۱۷) کے حساب سے

سوا چار سو ہوتی ہے۔ اس سے میرے قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ دتاسی کے نسخے میں "مثنویاں" نہیں، بلکہ ایک مثنوی تھی۔

"گلشن ہند" کے سلسلے میں ایک اور بات قابل ذکر یہ ہے کہ علی لطف کے معاصر اور فورٹ ولیم کالج کے ادیب حیدر بخش حیدری نے بھی ۱۲۱۵ھ میں اردو شعرا کا ایک تذکرہ اسی نام سے لکھا تھا، جو اب تک منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ یہ تذکرہ بھی اردو میں لکھا گیا ہے۔[1]

**غزل** کریم الدین نے لطف کے بارے میں ایک عجیب بات یہ لکھی ہے کہ وہ ایک ظریف شاعر ہے لیکن لطف کی غزل سے، جس کا سرمایہ ہماری دسترس میں ہے، یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ ان کو ظرافت سے کوئی دور کا بھی تعلق تھا۔ غزل کے علاوہ اگر انھوں نے کچھ اور کلام ظریفانہ چھوڑا تھا تو اور بات ہے۔

معاصر تذکرہ نگاروں کے بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علی لطف کو شاعرانہ مرتبہ کے لحاظ سے، اپنے ہم عصر شعرا میں ایک امتیاز حاصل تھا۔ قدرت اللہ شوق نے اپنا تذکرہ "طبقات الشعرا" ۱۱۸۸ھ میں

---

[1] اس تذکرہ کا ایک نسخہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے انڈین انسٹیٹیوٹ میں محفوظ ہے۔ خطبات گارساں دتاسی کے حاشیہ میں یہ لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ کھمبایت کے کسی خانگی کتب خانے میں بھی موجود تھا (خطبات ص ۱۰۱)۔

مرتب کیا تھا۔ یہ زمانہ لطف کے عنفوان کا تھا۔ تاہم اس زمانے تک بھی وہ شاعر کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے اور کافی شہرت بھی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ شوق لکھتے ہیں:

"شاعر پرزور و خوش گفتگو است ..... اشعارش از لطف خالی نیست"[1]

مصحفی جیسے استاد نے بھی انھیں "شاعر خوش فکر" کے لقب سے یاد کیا ہے[2] حکیم قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ "مجموعہ نغز" مصحفی سے کوئی بارہ برس بعد مرتب ہوا تھا ظاہر ہے کہ اس زمانے تک لطف کو شعر و سخن کے معیار و ں پر اچھا عبور حاصل ہو چکا تھا، چنانچہ قاسم انھیں "شاعر خوش نوا" لکھتے ہیں۔[3]

اوپر کے بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لطف کو اپنے زمانے کے غزل گو شعرا میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

لطف کے ذوق غزل گوئی کی نشو و نما لکھنو کے شعری ماحول میں ہوئی تھی، لیکن ان کے زمانے تک لکھنو کے دبستاں کا مخصوص طرز نمایاں نہیں ہو پایا تھا۔ لکھنو کی شعری فضا پر ابھی تک دہلی کے اساتذہ کا اثر چھایا ہوا تھا، تاہم لطف کی غزل کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ لکھنو کا مخصوص طرز بھی نکھرتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ لطف کی غزل میں دہلی

---

[1] طبقات الشعراء ق ۱۴۹ الف ب

[2] تذکرہ ہندی ص ۲۰۱ — [3] مجموعہ نغز ج ۲ ص ۱۴۸۔

اور لکھنو کے رنگ ادل بدل ہوتے رہتے ہیں۔ قاسم کے بیان کے مطابق لطف اپنے آپ کو لکھنو کے دبستاں سے وابستہ کرتے تھے۔ لیکن یہ وابستگی حقیقی سے زیادہ ذہنی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ایک عرصہ کے بعد، جب لکھنو کا مخصوص طرز نمایاں ہونے لگا، تو لطف بھی اس سے دامن بچا نہ سکے، چنانچہ اس انداز کے کئی شعر اور غزلیں ان کے دیوان میں مل جاتی ہیں جن میں حقیقت سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی نمایاں ہے اور لفظی رعنائیں بھی شعر میں کافی دخیل ہو گئی ہیں۔ کہیں کہیں لکھنو کی شوخ نگاری کا اثر بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔

مثال کے لیئے ذیل کے شعر پیش کئے جا سکتے ہیں:۔

وہ پھول قفس کے مرے گر چاک سے باندھے ‌ ‌ مرہم دکھے تو اس دل صد چاک پہ صبا

---

یہ کہئے کہ دل لینا ہی منظور نہیں ہے ‌ ‌ کیوں چاک کا اور داغ کا لیتے ہو بہانا

---

اڑا کیوں رنگ ہے چہرہ کا، یہ فرمایئے صاحب
گنوا بیٹھے کہیں دل، بس نہ اب شرمایئے صاحب

---

آخری مطلع جس غزل کا ہے، وہ ایک مسلسل غزل ہے اور لکھنو کے انداز میں لکھی گئی ہے۔

**میرا ایک معیار** ‌ ان مثالوں سے قطع نظر لطف کی غزل میں دہلی کا اثر

بنیادی تاثر کے طور پر موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لطف کے لئے غزل میں میر ایک معیار اور ایک نمونہ تھے۔ یہ صحیح ہے کہ لطف میر کے معیار وں تک نہ پہنچ سکے، تاہم کئی غزلیں انھوں نے میر کے اثر کے تحت لکھی ہیں مثلاً :-

یاروں نے یہ تو کہیئے، کیا کیا سمجھائیاں ہیں
بے وجہ تو نہیں یہ ہم سے دکھائیاں ہیں

یہ پوری غزل میر ہی کا انداز رکھتی ہے۔ چند اور شعر ملاحظہ ہوں :-

وہ سامنے ہی اگر اپنے ایک آن رہا
نہ آنکھ بھر کے کبھی ڈر سے ہم تو دیکھ سکے

دلبر و دل کی عمارت نہ بنی بعد شکست
کٹی عالم کی گو اس قصر کی تعمیر میں جاں

آج تھا دل میں کہ درد دل کہیں گے اُس سے کچھ
آتے ہی پس اُس کے کچھ اوسان سے جاتے رہے

نہ کر اے لطف ناحق رہ رواں دیر سے حجت
یہی رستہ تو کھا کر پھیر ہے کعبے کو جا نکلا

---

**ہم مرکز ماخذ** لطف اور غالب کی فکر کے بعض زاویے ایک مشترک خط پر مس کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ غالب کی ایک مشہور غزل ہے جس میں انھوں نے برسات کی ایک رات کا سماں باندھا ہے۔ ان کے محبوب نے ان کے یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن برسات

اس کے لئے بہانہ بن گئی ۔ وہاں جلوہ گل" بساط صحبت احباب تھا"۔ اِدھر عاشق کے اضطراب کا یہ عالم تھا کہ اس کے لئے زمین سے لے کر آسمان تک "سوختن کا باب تھا"۔ لطف کی ایک غزل میں بھی اسی طرح کی تقابلی کیفیت پیش کی گئی ہے۔ اس غزل کے چند شعر ہیں :۔

تم ہو بزم عیش ہے وہاں اور صحبت داریاں
ہم ہیں کنج غم ہے یہاں اور جہان سے بیزاریاں

تم کو سیر باغ و گلگشت چمن کا وہاں ہے شوق
یہاں بدن پر ہیں ہجوم داغ سے گل کاریاں

یہاں برنگ پیکر تصویر ہم خاموش ہیں
گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں

قہقہے تم مارتے ہو وہاں یہ آواز بلند
دشمنوں سے یہاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں

یہ مشترک الہام ہے یا مشترک فکر یا ماخذ کا نتیجہ ! لطف اور غالب کے یہاں اشتراک فکر کے اور بھی کئی پہلو ہیں ۔

جدید تنقید کو یہ شکایت ہے کہ غزل گو شاعر اپنی فکر کے اطراف ایک حصار سا تعمیر کر لیتے ہیں جس میں خارجی دنیا اور خارجی محرکات کو داخل ہونے کا موقع نہیں رہتا ۔ اپنے حصار کے اندر وہ موضوعات کی الٹ پھیر اور تجربات کے اظہار میں ادل بدل کرتے رہتے ہیں ۔ لطف بھی ان شعرا سے خارج نہیں ہیں ۔ ان کے یہاں کہیں کہیں ایسے

کائناتی حقائق بھی مل جاتے ہیں، جن کو ان سے پہلے کے اساتذہ کی فکر نے بھی مس کیا تھا، لیکن لطف کے یہاں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تجربوں کا پھر سے تجربہ کیا گیا ہے، اور بعض جگہ تو ان کے بیان کا انداز ایسا ہے کہ کوئی کہہ سکتا ہے، یہ ان کے اپنے تجربات ہیں۔ مثلاً:

زہے غفلت کہ ہم دنیا کو بزم عیش سمجھے تھے
کھلی چشم حقیقت بیں تو کام اژدہا نکلا

غیروں کے مقابلے میں اپنوں سے جو رنج پہنچتا ہے، وہ زیادہ جاں گسل ہوتا ہے۔ لطف کہتے ہیں:

بیگانوں نے کبھی نہ وہ کانوں سنائی بات
افسوس آشنا نے جو آنکھوں دکھائی بات

---

## شعر اور شاعر

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ، غزل شاعر کی زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ یہ بات ایک بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن ہر زمانے اور ہر غزل گو کے بارے میں صحیح نہیں۔ ابتدائی غزل گو شعرا، جیسے محمد قلی، ولی، سراج، میر، درد اور غالب کی شاعری میں ان کی زندگی سے بڑی حد تک ہم آہنگی موجود ہے۔ علی لطف کے یہاں بھی اس کا پرتو ملتا ہے۔ اصل میں استعارے اور کنائے کے استعمال کی وجہ سے اکثر شعرا کے حقیقی جذبات، زیر نقاب رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایک عظیم شاعر، استعارے اور کنائے کو بھی اس سلیقے اور

قدرت کے ساتھ برت جاتا ہے کہ اس کے تصورات اور جذبات کے خدوخال جو پس پردہ ہیں، صاف جھلک جاتے ہیں۔ لطف کی غزل کو پڑھ کر ہم کو ان کے طرزِ زندگی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ لکھنؤ میں جہاں ان کی غزل پروان چڑھی، لطف کی تاثر پذیر زندگی کا ایک بڑا حصہ گزرا تھا۔ وہاں وہ زندگی کی مسرتوں اور آسائشوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوئے تھے۔ جس عیش و آرام سے اس زمانے میں ان کی عمر بسر ہوتی تھی، اس کا اندازہ ان کے قصیدے کے ایک شعر سے ہوتا ہے، جو ان کے قیام حیدرآباد کے زمانے میں لکھا گیا تھا! انھوں نے اپنی مرفہ حالی کا اظہار جس شعر میں کیا تھا، وہ نقل کیا جا چکا ہے۔ اسی طرزِ زیست کا اثر تھا کہ لطف زندگی کو سبک سیری اور سہل انگاری سے لیتے تھے۔ ان کی غزل میں عاشقانہ اشعار کافی ہیں، تاہم ان کے جذبات میں دلوں کو پگھلا دینے والی کیفیت نہیں ہے۔ ان کے بیانِ غم سے بھی یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ عشق ان کے لیے کبھی سنگِ گراں رہا تھا۔ اسی لئے ان کی ہجر و میاں کوئی درد انگیز اثر پیدا کرنے کی بجائے، رسمی اور روایتی بن جاتی ہیں۔ لکھنؤ کے عیش پرستانہ ماحول کا ایک جز شاعری بھی تھی۔ چنانچہ لطف کا کلام پڑھتے ہوئے، ہم کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ انھوں نے ایسے تجربات کا اعادہ کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے ذاتی نہیں تھے۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی غزل سطح سے اوپر نہیں اٹھتی اور ان کے جذبات میں جنوں انگیز کیفیتوں کے کہیں شائبے نظر نہیں آتے۔ اس کی بجائے، ایک متوازن جذبہ اور ایک سنبھلی ہوئی کیفیت ان کی غزل میں نمایاں ہے۔

ایک غزل میں لطف نے صاف اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے دل میں بھی جذبۂ عشق بے پناہ ہے، مگر انھیں کوئی ایسا حسن کارفرما نہ مل سکا، جو اس جذبے کو بے نقاب کر دیتا۔ اس شعر کے پیچھے جو خواہش ہے، اس میں رسمیت، بناوٹ یا تکلف نام کو بھی نہیں ہے۔ کہتے ہیں :۔

دکھا دیں بے ستون چرخ کا عالم تجھے فرہاد
جو مل جائے ہمیں بھی کارفرما کوئی شیریں سا

لطف کی زندگی اور ان کے کلام میں ہم آہنگی کا ایک پرتو یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں کئی اشعار ایسے ملتے ہیں، جن سے ان کی زندگی کے نہج، ان کی فکر کے مخصوص زاویوں اور ان کے معتقدات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

لطف، بہرحال شاعر تھے اور ہر جہت اور ہر زاویے سے شاعر تھے۔ ان کے شعور اور تحت شعور میں اپنے زمانے کی ساری شعری تہذیب اور ادبی تحریکیں جذب ہو چکی تھیں جن کا اظہار ان کی شاعری میں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ان کے کلام کو پڑھنے والے

یہ دیکھیں گے کہ ان کی غزل، فکر اور اظہار، ہر اعتبار سے، چند پائدار قدروں سے بالکلیہ خالی نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے عام معاصرین میں سب سے بلند نہیں تو ان میں سے کسی سے پست بھی نہیں تھے۔ ان کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں :

ہے کیش محبت میں حرام اس پہ غم دوست
جو سمجھا حلال آپ پہ آرام محبت

از بس نہ ہوا ہم سے سر انجام محبت
شرماتا ہے دل لیتے ہوئے نام محبت

---

دوراز حیا ہے اس حرکت اور سکون پر    پابند دست غیر جو ہووے عصا کی طرح

---

ہم بخت سیاہوں کو دن رات مساوی ہے    ہے شب سے تو مت کل روز اور روز شب مشکل
کیونکر نہ بھلا ہمدم ہو زندگی اب مشکل    ہیں دل میں تو سو باتیں اور جنبش لب مشکل

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ لطف ہمیشہ شعر کہنے کی خاطر نہیں سوچتے تھے بلکہ کبھی کبھی سوچنے کی خاطر بھی شعر کہتے تھے اور ان کی فکر کی بساط میں کچھ سرمایہ بھی ہوتا تھا۔

**رباعی** علی لطف نے رباعیاں بھی لکھی ہیں، لیکن رباعی میں ان کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے۔ انھوں نے انھیں موضوعات پر رباعیاں لکھی ہیں، جو اس صنف کے ساتھ عام طور پر مخصوص ہیں۔ خمریات اور اخلاق و حکمت، ان کی رباعی کے موضوع ہیں۔ اپنے

زمانے کے اہم واقعات اور بعض مشہور معاصرین سے متعلق بھی انھوں نے کچھ رباعیاں کہی تھیں۔ پیشکار دکن مہاراجہ چندو لعل نے اپنا مشہور آئینہ محل اسی زمانے میں بنوایا تھا، لطف نے بھی اور شعرا کی طرح اس کی تعریف میں ایک رباعی کہی تھی۔ غلام مصطفےٰ خاں سخن نے کہا تھا:۔

واشد کے لئے دل کے جو گلشن کو چلا ہے
اس سے تو وہ آئینہ محل جائے تو اچھا

لطف کی رباعی حسب ذیل ہے:۔

جنت سے کہے بزم میری تو دیکھو
یوں جام کہے جم سے کہ مجھ کو دیکھو
ہر آئینہ آئینہ محل کا تیرے
کہتا ہے سکندر سے کہ منہ تو دیکھو

ایک اور رباعی انھوں نے عید قرباں کے موقع پر ارسطو جاہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔

حیدر آباد کی مشہور شاعرہ، اور رقاصہ ماہ لقا بائی چندا کے نوبت خانے اور نوبت کے بارے میں بھی انھوں نے ایک اچھی رباعی کہی تھی۔ ماہ لقا کو یہ نوبت نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے عطا کی تھی اور اسی موقع پر اسے ماہ لقا کے خطاب سے بھی سرفراز کیا تھا۔

لطف کی رباعی یہ ہے:۔

نوبت نے جو مہ لقا کی باصد شوکت
زیر و بم آسماں سے چاہی سبقت
ناہید نے ہنس کے مشتری سے کہا
اب لیلیٰ و شیریں کی کہاں ہے نوبت

## مثنوی نیرنگ عشق

لطف کی مثنوی کا تذکروں میں صرف حوالہ ملتا ہے لیکن خود مثنوی ابھی تک ادبی دنیا کی نظروں سے اوجھل رہی۔ یہ محض مخطوطوں کی شکل میں محفوظ تھی۔ اس کے مخطوطے بھی، عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔ تذکرہ نگاروں میں بھی صرف قدرت اللہ شوق مصحفی اور منشی کریم الدین نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی ان تذکرہ نگاروں کی نظر سے گزری تھی، چنانچہ قدرت اللہ شوق اور مصحفی دونوں نے اس کی تعریف کی ہے، مصحفی لکھتے ہیں:

"مثنوی آبدار بسلک نظم کشیدہ"

مثنوی ہی کا ذکر کرتے ہوئے مصحفی نے لطف کے سودا سے تلمذ کی طرف بھی اشارہ کیا تھا، کہ "ازیں جہت خود را بہ شاگردی مرزا متہم می کنند"۔ لیکن "واللہ اعلم بالصواب" کے الفاظ میں اپنے شک کا اظہار بھی کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ لطف کی مثنوی اور سودا کی مثنوی میں مناسبت نہیں ہے۔ لطف کی مثنوی، ایک مکمل قصہ ہے۔ سودا کی صرف ایک مثنوی "زرگر و پسر شیشہ گر" قصے پر مشتمل ہے، لیکن قصہ، بہت ہی غیر معتاد اور تکمیل کے لحاظ سے اسقام سے خالی نہیں۔

## مثنوی کا زمانہ تصنیف

لطف کی مثنوی کس زمانے میں لکھی گئی اس کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔

مثنوی کے جتنے مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں، ان میں سے کسی میں بھی اس کا سنہ تصنیف درج نہیں ہے۔ تاہم جو شواہد ہماری دسترس میں ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی لطف کے لکھنؤ میں قیام کے ابتدائی زمانے میں لکھی گئی تھی۔ لطف کے لئے یہ فراغت اور بے فکری کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ آنے کے بعد انھیں جو طرزِ زندگی نصیب ہوا، اس میں ذہنی لطافتوں اور مسرتوں کا نشہ تیز تھا، اور یہ ان کے عنفوان کا زمانہ بھی تھا۔ چنانچہ مثنوی کے لئے جو عشقیہ موضوع انھوں نے انتخاب کیا، وہ ان کی عمر کے تقاضا کے عین مطابق تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں مختصر مثنوی شعر وسخن کے ذوق کا ایک جز بن گئی تھی۔ چنانچہ آبرو کے علاوہ سودا اور میر نے بھی کئی مثنویاں لکھی تھیں۔

لطف کی مثنوی کا ذکر سب سے پہلے ہم کو مرزا قدرت اللہ شوق کے تذکرہ "طبقات الشعرا" میں ملتا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ کا مرتبہ ہے۔ اس وقت علی لطف کو دہلی سے لکھنؤ آئے ہوئے تین چار سال ہوئے تھے۔ میر تقی کی مثنوی "دریائے عشق" جو بہت مشہور ہوئی اور جس کی مناسبت لطف کی مثنوی سے ہے، اس کی ترتیب کے سنہ کا بھی ہم کو علم نہیں ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اس مثنوی پر بحث کرتے ہوئے اس کے سنہ تصنیف کا کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کے حوالے سے انھوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ جو فارسی مثنوی اس کا ماخذ ہے، وہ ۱۱۳۰ھ کی مکتوبہ ہے[1]۔

---

[1] میر تقی میر ص ۴۳۹۔

مصحفی کی مثنوی "بحر المحبت" میر کی مثنوی "دریائے عشق" کا چربہ ہے،
اس کے مرتب مولوی عبدالماجد دریابادی نے دیباچے میں "دریائے عشق"
کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مثنوی ۱۲۴۱ھ سے چند سال قبل
لکھی گئی تھی[1] مولانا کا یہ بیان مبہم ہے۔ علی لطف نے "تذکرہ گلشن ہند"
میں میر کے حالات لکھتے ہوئے، ان کی مثنوی "دریائے عشق" کا تذکرہ خاص
طور پر کیا ہے، اور اس کی شہرت کا حال بھی لکھا ہے۔ اس سے صاف
ظاہر ہے کہ یہ مثنوی ۱۲۱۵ھ سے قبل لکھی جا چکی تھی۔

سب سے پہلی مثنوی جس کی تصنیف کے سنہ کا ہم کسی حد تک تعین
کر سکتے ہیں، وہ لطف کی مثنوی "نیرنگ عشق" ہے۔ قدرت اللہ شوق
کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۱۱۸۸ھ سے قبل لکھی جا چکی تھی۔ اس لحاظ
سے "نیرنگ عشق" شمالی ہند کی اولیں مختصر عشقیہ مثنویوں میں سے ہے۔

## شمالی ہند کی مثنویاں

لطف سے پہلے بھی شمالی ہند میں کچھ مثنویاں
لکھی گئی تھیں، جیسے آبرو کی مثنوی "در تعریف
معشوق خود" شاہ حاتم کی ایک دو چھوٹی چھوٹی مثنویاں، میر اور سودا کی
مثنویاں۔ لیکن ان میں شہرت صرف میر کی ایک دو عشقیہ مثنویوں کو حاصل
ہو سکی۔ مثنویوں کے طول کے لحاظ سے ہم ان کو تین قسموں پر تقسیم کر سکتے
ہیں :—

---

[1] دیباچہ بحر المحبت ص ۲۔

**(۱) طویل مثنویاں:** دہلی کے ابتدائی دور میں صرف ایک طویل مثنوی "خواب و خیال" لکھی گئی۔ لیکن جہاں تک قصے کا تعلق ہے یہ مثنوی ناقص ہے۔ قصے سے اس کا آغاز ہوتا ہے، سراپا پر اس کا منتہا اور تصوف میں اس کے انجام کا سر رشتہ گم ہو جاتا ہے۔ بعد میں "سحر البیان" جیسا شاہکار لکھا گیا۔ طویل مثنویوں میں خاکے کے خدوخال اُبھارنے اور کرداروں کو کسی حد تک توجہ کے ساتھ سرانجام کرنے کا موقع ملتا ہے، اس کے علاوہ مرقع نگاری اور جذبات نگاری کی بھی گنجایش ہوتی ہے۔

**(۲) مختصر مثنویاں:** مختصر مثنویوں میں زیادہ تر مرقعے لکھے گئے ہیں، یا کبھی کوئی قصہ بھی بیان کیا گیا ہے اور کبھی صرف ایک واقعہ (EPISODE) اس طرح کی مثنویوں میں میر کی وہ مثنویاں جو برسات میں اپنے گھر کی تباہی پر یا سرائے میں کتوں کی لڑائی پر لکھی گئی ہیں، اہمیت رکھتی ہیں۔

**(۳) متوسط طول والی مثنویاں:** اس طرح کی مثنویوں کی تعداد اُردو میں کافی ہے، لیکن ان میں میر کی قصہ وار مثنویوں کو جیسی مقبولیت حاصل ہوئی، دوسری مثنویوں کو حاصل نہ ہو سکی۔

آبرو کی مثنوی "در تعریف معشوق خود" سودا کی مثنوی "زرگر و پسر شرنہ گہ" اور مصحفی کی مثنوی "بحر المحبت" بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ ان مثنویوں میں

فن کے ارتقا کی تھوڑی بہت گنجایش ہوتی ہے اور پلاٹ کو سیدھے سادھے انداز میں نشو و نما دینے اور کرداروں کے کسی ایک پہلو کو نمایاں کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے۔ لطف کی مثنوی بھی انھیں میں شامل ہے۔ جہاں تک قصہ دار مثنویوں کا تعلق ہے، ان کے مقابلے میں، نثر میں مختصر قصے ہیں۔ بنیادی طور پر ایسی مثنویاں صرف ایک واقعے کے اطراف گھومتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی نگار کے ذہن کی صلاحیتیں، قصے کے مرکزی کردار کو اُبھارنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے قصے کے تاثر کا سارا دار و مدار مرکزی کردار ہی پر ہوتا ہے۔ لطف کی مثنوی کی بھی یہی صورت ہے لیکن یہ مثنوی طول کے اعتبار سے "سحر البیان" جیسی طویل اور "شعلۂ عشق" اور "دریائے عشق" جیسی مختصر مثنویوں کی درمیانی شکل کی مثنوی ہے۔

## رومانیت اور احساس مکافات

لطف کی یہ مثنوی، اس زمانے کی دوسری مثنویوں کی طرح ایک عشقیہ قصے پر مشتمل ہے۔ "نیرنگ عشق" سوائے انجام کے میر کی عشقیہ مثنویوں کی طرح فوق الفطرت عناصر سے خالی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے قصے کا منتہا ایک غیر معتاد واقعے بلکہ حادثے پر ہوتا ہے۔ قصے میں ہیرو کا محبوبہ کی سواری کو روانہ ہوتے ہوئے دیکھ کر، درخت کی چوٹی پہ چڑھ جانا اور وارفتگی کے عالم میں نیچے گر کر مر جانا کوئی غیر فطری بات نہیں۔ شہزادی کے دل میں نوجوان سے محبت کے جذبے کا دفعتاً یک

پیدا ہو جاتا، ہمارے اس قدیم اور مقبول عقیدہ کی ترجمانی ہے کہ عشق بے اثر نہیں رہتا۔ ہمارے شاعروں اور قصہ نگاروں اور ان کے سامعین و قارئین کا یہ بڑا نفسیاتی سہارا تھا۔ یہ تصور مکافات اور آسمانی تلافی (NEMISES) کے عقیدے سے گہرا ربط رکھتا ہے۔ شہزادی کا اپنے عاشق کی قبر پہ آکر جاں بحق ہو جانا، اسی عقیدے کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد کا واقعہ قطعاً غیر معتاد بلکہ فوق فطری ہے۔ اس طرح کے واقعات ہمارے شاعر اور افسانہ نگار عشق کا اعجاز دکھانے اور زیب داستان کے لئے بڑھا لیتے ہیں۔ لیکن اس میں شبہ ہے کہ خود ان کو اس پر اعتقاد ہوتا تھا۔ میر نے بھی "دریائے عشق" اور "شعلۂ عشق" میں اسی عام تصور کے ماتحت کچھ غیر معتاد اور فوق فطری واقعات داخل کر دئے ہیں۔ "شعلۂ عشق" میں آسمان سے ہر شب ایک شعلہ کے نمودار ہونے اور سطح دریا پر گھوم گھوم کر "پرسرام تو کہاں" کا نعرہ بلند کرنے اور پھر پرسرام کو لے کر غائب ہو جانے کا واقعہ، فوق فطری سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ ۷

## تین کردار

مثنوی "نیرنگ عشق" کا خاکہ سیدھا سادھا ہے۔ کرداروں میں تین اہم ہیں، ایک تو نوجوان عاشق جو قصے کا ہیرو ہے۔ دوسری شہزادی، اور تیسرا ہمدرد درویش۔ نوجوان عاشق قصے کا مرکزی کردار ہے۔ ان تین اہم کرداروں کے پس منظر میں کئی اشخاص اور بھی ہیں، جن سے قصے کی تصویر میں شاعر نے

رنگ بھرنے کا کام لیا ہے، جیسے شہزادی کا باپ شاہ کامران، ملکہ، کنیزیں، وزیر، ہمسایہ وغیرہ۔ قصے میں حسن و عشق کے لاگ اور لگاؤ کی لازوال کرشمہ سازیوں میں سے ایک نصب العینی رُخ کو پیش کیا گیا ہے۔ ان ہوش ربا کیفیتوں کے کچھ اجزا مشترک نوعیت کے ہیں اور ہم کو اس طرح کی کہانیوں میں اکثر مل جاتے ہیں۔ "نیرنگ عشق" کا نوجوان خاص طور پر میر کی مثنوی "دریائے عشق" کے "جوان رعنا" کا مدمقابل ہے۔ وارفتگیٔ عشق، اور والہانہ سپردگی میں دونوں ایک سے ہیں۔ اس کی آہ وزاریوں اور بے تابانہ فریاد و فغاں سے جس طرح ہمسایے بیزار تھے، اسی طرح اس نوجوان عاشق کی بے قرارانہ نالہ فرسائیوں سے اس کے بھی ہمسایے تنگ آگئے تھے۔ "نیرنگ عشق" کا ہمدرد درویش میر کی مثنوی "اعجاز عشق" میں درویش غم خوار کی صورت میں نمایاں ہے۔ ایک اور مماثلت قصے کے انجام میں بھی پائی جاتی ہے۔ حسن و عشق کی ہم آہنگی، بلکہ یک رنگی پر دونوں قصے ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ مماثلتیں اور یہ مشابہتیں یہیں پر ختم ہیں۔ اس کے بعد دونوں مثنویاں الگ الگ خطوط پہ آگے بڑھتی ہیں۔

**رفتار واقعات کی انفرادیت**

"نیرنگ عشق" کے واقعات کی رفتار اپنے خطوط پر انفرادی انداز میں بڑھتی ہے، اور اس کا ارتقا بھی اپنے مخصوص نہج پر عمل میں آتا ہے۔ شہزادی کا سیر کے لیے نکلنا، اور اس دیوانے کے کنج میں آنا،

نوجوان دیوانے کی اس جبلی تلاش اور بے چینی کے مقصد کا حصول تھا، جس کے آثار ہم کو نوجوان کی بظاہر بے سبب آشفتگی اور بے وجہ سرگشتگی کی صورت میں دکھائی دیے تھے۔ کسی نوجوان کا کسی حقیقتاً دید و وادید سے پہلے شوریدہ سری میں مبتلا ہو جانا، ایک مخصوص نفسی کیفیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کی تفسیر ہم کو شاید حالی کے اس شعر میں ملتی ہے:

عشق اُس وقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا
گودیوں میں تھا تجھے جب سے کھلایا جاتا

حالی نے یہاں ایک نفسی اور کائناتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، غالب نے اس کیفیت کو ایک اور انداز سے پیش کیا ہے۔ محبت کا جذبہ بعض طبیعتوں کے لئے فطری ہے۔ جب تک انھیں اپنے اس جذبے کی تکمیل کے لئے موضوع دستیاب نہیں ہو جاتا، وہ اپنی زندگی میں ایک خلا، ایک بے مقصدیت محسوس کرتے ہیں۔ جب یہ موضوع مل جاتا ہے تو ان کی تلاش کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ غالب کہتے ہیں:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

شبہ نقطۂ عروج[1] "نیرنگِ عشق" کے نوجوان کی سرشت کا خمیر محبت سے

---

[1] (PSEUDO-CLIMAX)

ہوا تھا، اور اس جذبے کے اظہار کے لیے جب تک کوئی محرک اسے نہیں ملا تھا، اس کی زندگی میں ویرانیاں اور اداسیاں ہی تھیں۔ جوں ہی یہ محرک رو در رو ہو جاتا ہے، کہانی کا خطِ دلچسپی یکا یک ابھرنے لگتا ہے۔ پھر جب یہ مقصد اس سے دور ہونے لگتا ہے، تو نوجوان کا اضطراب بھی بڑھنے لگتا ہے، اور اپنے مقصودِ حیات کو جس کی چاہ میں اس نے مضطرب دن اور بے چین راتیں بسر کی تھیں، نظر سے اوجھل ہوتا دیکھ کر، عالمِ وارفتگی میں وہ پیڑ پر چڑھ جاتا ہے اور جیسے جیسے شہزادی کی سواری آگے کو بڑھتی جاتی ہے، اس کا اضطراب اسے اوپر اور اوپر کو بڑھاتا جاتا ہے۔ عالمِ وارفتگی، درخت کی انتہائی چوٹی! اور پھر اوپر بڑھنے کی خواہش! نتیجہ ظاہر ہے۔ درخت سے وہ ایک پختہ ثمر کی طرح گرا اور زندگی پاش پاش ہو گئی۔ نوجوان نیچے گر کر عشق کے منتہا کو پہنچ گیا۔

لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ آگے شاعر کو جذبہ محبت کی لاج رکھنی تھی، وہ نوجوان کے جان دینے کو رائگاں کس طرح جانے دیتا؟ عشق کے بارے میں تو اس کا عقیدہ تھا:

زندگی میں گر رکھے عاشق سے فصل
خاک میں دے بعد مرنے کے یہ وصل

رِدِّ منتہا[۱] | اسی تقاضا کے مدنظر، کہانی میں ایک رِدِّ منتہا کا آنا بھی

[۱] (ANTI-CLIMAX)

ضروری تھا۔ تسکین جذبہ کی صورت نہ ہو تو کہانی کیسے کہی جا سکتی ہے؟ نوجوان عاشق جان دے کر محبوب کے دل میں گھر کر گیا۔ "دریائے عشق" کی حسینہ کی طرح شہزادی کو بھی جذبۂ عشق کشاں کشاں اس مقام پر لے آتا ہے، جہاں وہ نوجوان عاشق دفن ہوا تھا۔ اس نصب العینی قصے میں، آگے ایک سماجی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ شہزادی تھوڑی دور پر رک کر اپنی کنیز کو نوجوان کی خبر لانے کے لئے بھیجتی ہے۔ درویش سادہ مزاج عشق کے راز سے ناآشنا سارا ماجرا کنیز کو سنا گیا۔ اس کے بعد قصے کا حقیقی منتہا آتا ہے۔

## نقاط دلچسپی

"نیرنگ عشق" کا قصہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ واقعہ ہو نہ ہو، لیکن لطف کے قلم نے اس کو ایک ادبی حقیقت کا روپ دے دیا ہے۔ حزنیہ انجام بذات خود موثر ہوتا ہے، اس پر لطف کے کہنے کا انداز بھی موثر ہے اور اس میں ادبیت بھی موجود ہے۔ ابتدا میں انھوں نے میر کی طرح بارگاہ عشق میں اپنے جذبات عقیدت پیش کئے ہیں۔ عشق ایک درد ہے اور درد کی دوا بھی ہے۔

| | |
|---|---|
| مرہم زخم جگر خواراں ہے عشق | پنبہ داغ دل افگاراں ہے عشق |
| عشق تسکین دل پر درد ہے | عشق یار جان غم پرور ہے |
| عشق ہے درمان درد بیدلاں | عشق ہے نور نگاہ مقبلاں |

بارگاہ عشق میں اپنی عقیدت پیش کرنے کے بعد، وہ کہانی کا

آغاز کرتے ہیں۔ آغاز کے ساتھ ہی ہم اس نوجوان سے روشناس ہوتے ہیں جو زندگی کے سمندر میں ایک بے لنگر کشتی کی طرح جھکولے کھا رہا ہے۔ یہ نوجوان ابدی ہیں اور ہر کہانی میں ایک ہیں، میر کے یہاں "جوان رعنا" ہے، لطف کے یہاں وہی "جوان فرزانہ" ہے۔ یہ نوجوان آج بھی ہے اور ہمارے سماج میں بھی ہے۔ میر اور لطف کے نوجوان ہمسایوں کیلئے وبال جان تھے، ان کا سا طرز عمل رکھنے والے نوجوان آج بھی سماج کے لئے وبال ہیں۔ لطف کہتے ہیں:

وہ جو ہمسائے تھے اس کے گرد و پیش
بے خور و خوابی سے ہو کر سینہ ریش

اس مختصر سی مثنوی میں منظر نگاری کی گنجایش کم تھی، تاہم جہاں جہاں موقع ملا، لطف نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، اور منظر نگاری اور مرقع نگاری کے بھی کچھ اچھے نمونے پیش کئے ہیں مثلاً:

کوہ اور صحرا اسے لے تا دشت گل
تھی ہر اک تختے پہ مشق خط گل

تھا زمرد گوں بساط مرغزار
قطعۂ مخمل میں آب جو ئبار

سبزہ دلکش میں تھا یوں آب رود
چرخ پر ہو کہکشاں جیسے نمود

خندہ گل یک طرف تھا نازسے
نالۂ بلبل تھا سوا انداز سے

چشم نرگس باہمہ جوش خمار
مستی دوشیں سے یک سو سرمسار

تھی پریشاں زلف سنبل کی کہیں
چاک تا دامن قبا گل کی کہیں

لالۂ خونیں کفن تھے یک طرف
داغ سے باندھی تھی اک محشر کی صف

تھی کہیں شمشادنے کی سرکشی
ارغوان دشت کو تھی آگ دی

سطح آئینہ تھا سنگ آبشار
مست قہقہہ تھے تذروِ کوہسار

پھلی پھرتی تھی نسیم آبجو
مثل مستاں بے تکلف، چار سو

جست آموزی غزالوں کی کہیں
بلبلوں کو مشق نالوں کی کہیں

یک طرف کبکوں کو تھا شوقِ خرام
رقص سے ملجا تھا طاؤسوں کو کام

یہ منظر حسین بھی ہے، دلکش بھی اور رومان پرور بھی۔ لیکن جیسا کہ مشہور مصور ٹرنر نے کہا تھا، فطرت کا کوئی حسین سے حسین منظر بھی ایسا نظر افروز نہیں ہوتا، جب تک کہ خالق کی حسین ترین مخلوق اس میں موجود نہ ہو۔ چنانچہ نوجوان کے اس منظر میں پہنچنے کے بعد اس کی جو کیفیت ہوتی ہے، وہ ملاحظہ کے قابل ہے:

دیکھ دیوانے نے یہ صحرا کا جوش
بے تحاشا کر اٹھا دل سے خروش

پھر تو کی شورش جنوں نے اس قدر
فصل گل کی بھی نہ تھی اس کو خبر

ہم فغاں ہوتا تھا بلبل سے کبھی
جا الجھتا زلف سنبل سے کبھی

ہم زبانی اس کو گہہ سوسن سے تھی
گاہ نرگس سے بندھی تھی ٹکٹکی

شور طاؤسوں سے گھبراتا کبھی
پات کے کھٹکے سے ڈر جاتا کبھی

خندۂ گل پہ کبھی روتا تھا زار
گریۂ شبنم پہ ہنستا بے شمار

شاعر نے اس مرغزار میں نوجوان کے لئے ایک پراسرار کشش دکھائی ہے، جس کی وجہ سے وہ اس مقام کو اپنے قیام کے لئے پسند کرتا ہے۔ وہاں

ایک درویش بھی رہتا تھا۔ نوجوان کی حالت دیکھ کر درویش کو اس سے دلبستگی پیدا ہو گئی۔ وقتاً فوقتاً وہ اس کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری کرتا رہتا تھا۔ درویش کی غمخواریوں سے نوجوان کی آشفتہ مزاجی کچھ کم ہونے کو آئی تھی کہ شہزادی اس کے خرمن ہوش کے لئے ایک فتنہ سامان بن کر صحرا میں نازل ہوتی ہے۔ فطرت کی ستم ظریفی اور اتفاق دیکھئے:

بس کہ تھی دلکش یہ شدت واں ہوا — اڑ گیا پردہ کہیں چنڈول کا
بے تکلف وہ بلائے روزگار — ہو گئی اس دل جلے سے چشم چار
جوں نظر اس کی نظر سے وہاں لڑی — خرمن جاں پر یہاں بجلی پڑی
تھی نگہ یا ناوک خونخوار تھی — آنکھ کے ملتے ہی دل کے پار تھی

---

لطف کی قدرت بیان کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے جن میں انھوں نے شہزادی کی سواری کی واپسی کا اثر نوجوان دیوانے کے جذبات پر دکھایا ہے۔ کہتے ہیں:

تھا درخت یک واں نہایت ہی بلند — جس کی تھی ہر شاخ گردوں کی کمند
چڑھ گیا اس پر کہ اور اک آدھ دم — دور سے ہی دیکھتا ہے مغتنم
دیکھتا تھا گرچہ وہ آفت قریں — ہر نگہ تھی پر نگاہ واپسیں
جب تلک مد نظر تھا وہ غبار — میل بالا رکھتا تھا یہ خاکسار
جوں ہوا اس کی نظر سے وہ نہاں — پھر رہی اپنی خبر اس کو نہ یہاں

---

درویش کو اس نوجوان سے جو وابستگی ہو گئی تھی، اس کی لاش دیکھ کر اس کے دل کو دھکا لگا اور:

دیکھ کر درویش نے یہ ماجرا — ہو کے حیراں عشق کے نیرنگ کا
واں سے اٹھوا اس جگر افگار کو — کشتۂ تیرِ نگاہِ یار کو
لے گیا اس کو مکاں اور وہاں — آ گئے وحشت میں یہ بیٹھا تھا جہاں
ہو گیا تاریک آنکھوں میں جہاں — چشم سے دریائے خوں کر کے رواں
بولا وحشت ہی غلطی تھی کیا کہیں — ہوش کی تیرے تمنا تھی ہمیں
سو تجھے یہ کچھ سجھائی ہوش نے — کیا ہی بے ہوشی دکھائی ہوش نے
واں بنایا اس ستم کش کا مزار — خاک میں سونپا دلِ امیدوار

شہزادی دیوانے کی موت سے بے خبر تھی، اس کے باوجود عشق کی نیرنگی ملاحظہ ہو:

وہ بلائے جانِ اربابِ نیاز — اتری تو دولت سرا میں آ بہ ناز
پر دلِ نازک بہ زیرِ بارِ عشق — منکشف چہرہ پہ سب اسرارِ عشق
شاد و خنداں یا تو مثلِ گل تھی وہ — یا کہ رشک افزائے صد بلبل تھی وہ
پر حیا از بس کہ دامنگیر تھی — بے صدا جوں بلبلِ تصویر تھی
گرچہ تھا شدت سے ضبطِ اضطرار — پر کوئی دل پر ہے اپنا اختیار
دردِ دل کی پھر تو طغیانی ہوئی — کیسی طغیانی کہ دیوانی ہوئی
بولی جی شدت سے گھبراتا ہے آج — خود بخود کچھ دم رکا جاتا ہے آج

قصرِ شاہی ہے سیاہ زنداں مجھے — خوش نہیں آتا رخِ خنداں مجھے
جو خواصیں محرمِ راز اس کی تھیں — مونسِ جاں اور دم ساز اس کی تھیں
ساتھ لے کر ان کو وہ آرامِ جاں — جانبِ صحرا ہوئی خوش دل رواں

آخر جذبِ عشق اسے دیوانے کی قیام گاہ تک کھینچ لاتا ہے، لیکن وہاں پہنچ کر اس کی مشتاق نظریں جب نوجوان کو نہیں پاتیں تو وہ:

بولی یوں اک خادمہ سے بے حجاب — پوچھ اس درویش سے جا کر شتاب
آج وہ دیوانۂ آفت قریں — کیا سبب ہے جو نظر آتا نہیں
جوشِ وحشت میں مگر وہ مستمند — اور کوئی دشت کر بیٹھا پسند
لا خبر اس بے خبر از خویش کی — سینہ چاک و جاں بلب دل ریش کی

کنیز درویش کے پاس پہنچی اور اس سے جو کچھ سنا تھا آکر شہزادی سے کہہ دیا۔ شہزادی پر بجلی سی گری:

بعد کتنی دیر کے آپے میں آ — بولی ظالم پھر تو کہہ یہ کیا کہا
پھونک دیا آتش یہ تو نے ہے غضب — جل گیا کاشانۂ دل جس سے سب
کر دیا غارت متاعِ صبر و تاب — ہو گیا قصرِ توانائی خراب
تج کے نام و ننگ سب بے اختیار — اتری وہ چنڈول سے دیوانہ وار
پھر کوئی رو کے سے رکتی تھی وہ ماہ — گرچہ تھے انجم صفت سب سدِ راہ

مضطرب افتاں و خیزاں برق وار | پہنچی اس بے دل تلک حد بے قرار
کر کے اک آلودہ حسرت نگاہ | گر پڑی مرقد پہ اس کی بھر کے آہ"

---

میرؔ بیان اور زبان کے بادشاہ ہیں، تاہم مشاہدے کے اعتبار سے لطفؔ کہیں کہیں میرؔ سے بھی بلند ہو گئے ہیں۔ دونوں "عشق" کی فتنہ سامانیوں کی روداد لکھتے ہیں، اس کے باوجود دونوں کی اپنی اپنی رسائی اور اپنا اپنا حوصلۂ نظر ہے۔ میرؔ کے لئے عشق ایک مستقل جانکاہ درد ہے، لیکن لطفؔ کے یہاں یہ تسکین دل پرورد ہے۔

**ایک حزنیہ**

"نیرنگ عشق" ایک حزنیہ ہے۔ حزن و ملال سے انسان ہمیشہ اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن حزن و ملال، جب ادب کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں تو ان میں بھی ایک حسن ایک کشش اور ایک رعنائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسی وسیلے سے فن آدمی کے ذہن کو اپنی گرفت میں اس طرح لے لیتا ہے کہ نیش گوارا بن جاتا ہے۔ غم جب ادب کا موضوع بن جاتا ہے تو اس کی کسک میں بھی لذت کا احساس ہونے لگتا ہے اور غم کے یہ نقوش اور گہرے ہو کر دیرپا ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے لذت غم پر دنیا کے پائدار ادبی کارناموں کی عظمت کی بنیاد قائم ہے۔

## زبان اور اسلوب

علی لطف کے بارے میں یہ کہا جا چکا ہے کہ وہ نوعمری ہی میں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے تھے۔ دہلی میں جو شعری اور ادبی روایات قائم ہو چکی تھیں، ان کے اثرات علی لطف کے ذہن پر تازہ تھے، اور انھیں اثرات کو وہ اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ ان نقوش کے ان کے ذہن پر جلد ہی مرتسم ہو جانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ گھر میں ان کے والد کی دلچسپی کی وجہ سے شعر و سخن کا چرچا رہا کرتا تھا۔ مشاعرے کی محفلیں بھی ان کے یہاں وقتاً فوقتاً منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لطف کے لکھنؤ آنے تک یہاں کی زبان کا کوئی خاص کینڈا نہیں بنا تھا اور شاعری کا بھی کوئی مخصوص اسلوب نشو و نما نہیں پایا تھا۔ اس کی وجہ تھی۔ لکھنؤ کی شعری اور ادبی فضائیں دہلی کے سخن سنجوں کے زمزموں سے گونج رہی تھیں۔ درباروں پر بھی انھیں کا رنگ جما ہوا تھا۔ اسی ماحول میں لطف نے اپنی مثنوی لکھی۔ یہی وجہ ہے کہ لطف کی مثنوی میں بھی وہی سادگی اور روانی پائی جاتی ہے جو دہلی کی مثنویوں کی خصوصیت ہے۔

لطف کی مثنوی کے موضوع اور اس کے اسلوب میں بڑی ہم آہنگی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے، جہاں اس میں عشق کی ساری سپردگی موجود ہے، اسلوب کے لحاظ سے اس میں ایک دردمندی نمایاں ہے۔ اس کی چست بندشوں، برمحل تشبیہوں،

استعاروں اور صنعتوں نے اس حزنیہ کارنامے کے تاثر کو دو آتشہ بنانے میں خاطر خواہ مدد دی ہے۔

لطف کی مثنوی سے حسن بیان، مرقع نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری کی جن صلاحیتوں کے اشارے ملتے ہیں، وہ مثنوی کے اختصار کی وجہ سے، پورے طور پر ابھرنے نہ پا سکیں اور نشو و نما کے اس مرحلے تک نہ پہنچ سکیں، جہاں تک میر حسن کی مثنوی پہنچ گئی ہے۔

## مثنوی کے نسخے

مثنوی "نیرنگ عشق" کے بارے میں یہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس کے مخطوطے کمیاب ہیں۔ مجھے تلاش سے اس کے جملہ چار مخطوطے دستیاب ہو سکے ہیں، جن میں سے ایک رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے (مخطوطہ ر) دوسرا کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ، (ع) تیسرا کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن (ا) اور چوتھا مجلس تحقیقات اردو حیدر آباد دکن (م) میں محفوظ ہے۔ ان میں سے آخری نسخہ سب سے زیادہ صحیح ہے۔ علی گڑھ کا مخطوطہ ناقص الاول اور نہایت ہی شکستہ اور زشت خط میں لکھا ہوا ہے۔ مثنوی لطف کو مرتب کرتے ہوئے میں نے مجلس تحقیقات اردو کے مخطوطے کو بنیاد بنایا ہے۔ اور اہم اختلافات فٹ نوٹ میں درج کئے ہیں۔

مثنوی کے نام کے لحاظ سے بھی مخطوطوں میں اختلافات ہیں۔ علی گڑھ کے مخطوطے میں نام ندارد ہے۔ آصفیہ کے نسخے میں مثنوی لطیف درج ہے۔ اور رام پور کے مخطوطے میں "مثنوی لطف" لکھا ہے۔ مجلس تحقیقات اردو کے مخطوطے کے سرورق پر سرخی سے "مثنوی لطف وگل" درج ہے لیکن ایک متبادل نام "نیرنگ عشق" بھی لکھا ہے۔ اسی لئے میں نے مثنوی لطف کے ساتھ دوسرے نام کو بھی متبادل نام کی حیثیت سے برقرار رکھا ہے۔

# مثنوی لُطفؔ

موسوم بہ

# نیرنگ عشق

بنویس دلا ببرکاغذ
بفرست بال نگارکاغذ

## حوالے Refrences

۱- مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ
۲- " رضا لائبریری رامپور
۳- " انجمن ترقی اردو علی گڈھ
۴- " مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عشق ہے کوئی[1] عجب نیرنگ باز
عشق ہے طرفہ بلائے جاں گداز

عشق زور[1] ہی برقِ خرمن سوز ہے
عشق زور ہی ناوکِ دلدوز ہے

عشق ہے یک شعلۂ آفاق سوز
عشق ہے یک آتشِ عالم فروز

عشق اندوہِ وفا کیشاں[2] ہے
عشق فریادِ جگر ریشاں[3] ہے

عشق ہے دردِ دلِ بیچارگاں[4]
عشق ہے خارِ رہِ آوارگاں

عشق زور ہی خانہ برانداز ہے
عشق ہی گہہ سوز گاہے[5] ساز ہے

عشق[6] باعث دل کی بیتابی کا ہے
عشق موجب بے خور و خوابی کا ہے

عشق سے یہ رنگ زرد و چشم تر
عشق سے لختِ دل[7] و خونِ جگر

---

۱ کوئی زور ہی نیرنگ ساز۔ ر۔ ۲ کیشاں ہے عشق۔ ا۔م۔ ۳ ریشاں ہے عشق۔ ا۔م۔ ۴ بیمارگاں۔ ر۔ ا اور ر میں بعد کا شعر پہلے ہے۔
۵ ہے گہہ ساز ہے۔ ر۔ عہ ھکذا
۶ ر مصرعۂ اولیٰ مصرعۂ آخر
۷ دل و جان و جگر۔ ر۔

عشق سے ہے رخ کی یہ پژمردگی　　عشق سے ہے دل کی یہ افسردگی

۱۰ عشق ہے شورِ سرِ[۱] دیوانگاں　　عشق ہے رنجِ وفا ہمخانگاں[۲]

عشق ہی ہے نت[۳] شکستِ رنگ ہے　　عشق ہی سے غنچہ ساں دلتنگ ہے

عشق ہے فریاد و زاری کا سبب[۴]　　عشق ہے آہ و فغانِ نیم شب

عشق کوئی زور ہی خوں ریز ہے[۵]　　عشق اک طرفہ بلا انگیز ہے

عشق[۶] ہے لب خشکیٔ دل خستگاں　　عشق ہے پابندیٔ وارستگاں

عشق ہی موجب ہے درد و آہ کا　　عشق باعث نالۂ جانکاہ کا

عشق سے ہے[۷] اشک سرخ و رنگ زرد　　عشق سے ہے بیدلوں کے دل میں درد[۸]

عشق[۹] ہے سنگِ سرِ اہلِ جنوں　　عشق ہے عشاق کا حالِ زبوں

عشق کوئی[۱۰] شہرۂ آفاق ہے　　آفتِ جان و دلِ عشاق ہے

الغرض[۱۱] ہے زور ہی نیرنگ باز　　ہے کبھی درد اور کبھی ہے چارہ ساز

---

[۱] شور و شر۔ ا۔م [۲] ہمزادگاں۔ ر [۳] یہ۔ ا۔م [۴] ر۔ شعر ندارد [۵] خوں بیز۔ م [۶] ر میں یہ شعر اور اس کے بعد کا شعر نہیں ہے۔ [۷] ہے یہ۔ ا۔م۔ [۸] عشق ہے یہ دل میں جانبازوں کا درد۔ ا۔م۔ [۹] ر میں یہ شعر نہیں ہے۔ [۱۰] ہی اک۔ ر [۱۱] ہے غرض..... نیرنگ ساز۔ ر۔

واقعی گر چارہ سازی پر[۱] یہ آئے ۲۰ لاکھ معشوقوں کو عاشق کر[۲] دکھائے

دل میں گر لاوے خیالِ آہِ گرم موم سے آہن کو کر دکھلائے نرم

زندگی میں گر رکھے عاشق سے فصل خاک میں دے بعد مرنے[۳] کے بہ وصل

مرہمِ زخمِ جگر خواراں[۴] ہے عشق پنبۂ[۵] داغِ دلِ افگاراں ہے عشق

عشق تسکینِ دلِ پُر درد ہے عشق یارِ جانِ غم پرورد ہے

عشق[۶] ہے سرمایۂ اربابِ دل عشق ہے پیرایۂ احبابِ دل

عشق ہے درمانِ دردِ بیدلاں عشق ہے نورِ نگاہِ مقبلاں

عشق ہے شمعِ مزارِ بے کسی عشق ہے چوں آہ یارِ بے کسی

کیا زبانِ خامہ کو تاب و تواں عشق کی انشا کرے جو داستاں

ایک حرفِ آہ گر کیجے رقم سوز سے جل جائے کاغذ اور قلم

دیکھو دلِ عاشقِ بے باک کا ۳۰ عشق سے پھرتا ہے پتلا خاک کا

---

۱ پر بنائے ۔ ر ۲ سے ملائے ۔ ر

۳ مردن ۔ ر ۴ خارہ ۔ م ۵ سینہ ۔ م

۶ ۔ یہ اور بعد کا شعر ر میں نہیں ہے ۔ مخطوطہ ع کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ۔

# آغازِ داستانِ عشق جوانے کہ مبتلا شد[1]

یک جواں بس عاقل و فرزانہ تھا ۔۔۔ لیک دل رکھتا بڑے[2] دیوانہ تھا

صید تھا وہ شاہباز عشق کا ۔۔۔ زخم خوردہ یکہ تاز عشق کا

درد دل میں سوز جاں میں اُسکی تھا ۔۔۔ نالہ ہر اک استخواں میں اُسکی تھا

تھا رہائی سے نہ مطلق اُس کو کام ۔۔۔ مرغ دل رکھتا تھا نت پابند دام

دیکھتا دلکش کوئی صورت اگر ۔۔۔ پھر نہ اپنی اُس کو کچھ رہتی خبر

گر نظر آتا کوئی گل پیرہن ۔۔۔ چاک کرتا[3] مثلِ گُل وہ رختِ تن

دیکھتا برجستہ گر یک[4] خال تھا ۔۔۔ جوں سپند اُس کا پھر[5] اور ہی حال تھا

کوئی کافر چشم گر پڑتا نظر ۔۔۔ دل وہ کٹتا اُس پہ جیسے[6] نیزہ تر

دیکھتا زلفِ پریشاں گر کہیں ۔۔۔ زلف سے ہوتا پریشاں تر کہیں

گر نظر آتا کوئی غنچہ دہاں ۴۰ ساتھ یہ دل تنگ ہوتا غنچہ ساں

---

؎۱ ر عنوان ندارد۔ ع آغاز داستان ؎۲ بہت۔ م ؎۳ ہوتا جیوں بلبل وہ دل سے نعرہ زن ر

؎۴ کوئی ر ؎۵ وہ ہی م ؎۶ دیکھتا وہ گر کوئی زلفِ سیاہ
ہو بہو حال اس کا ہو جاتا تباہ

الغرض وہ نوجوانِ خوش خصال — تھا خرامِ عشق کا نت[١] پائمال

رفتہ رفتہ یاں تلک شیدا ہوا — سر میں یک شورِ جنوں پیدا ہوا

جوں عَلَم آرا ہوئی دیوانگی — کی شکیب و صبر نے بیگانگی

طاقت و تاب و تواں و خورد و خواب — سب نے یکبارگی دیا اُسکو جواب

تھا نہ[٢] غیر از نالہ پھر اُس کا رفیق — نے بجز آہ و فغاں یارِ شفیق

کام تھا فریاد و زاری سے اُسے — تھا قرار اک بیقراری سے اُسے

آہِ گرم اُسکی سے ہر شب صبح تک — چشمِ انجم کی نہ تھی لگتی پلک

بسکہ دردِ دل سے وہ بیتاب تھا — دیدۂ تر سے[٣] گریزاں خواب تھا

جب کئی یک دن رہا[٤] یہ اُس کا حال — پاس والوں کو ہوا جینا محال

وہ جو ہمسائے تھے اُسکے گرد و پیش ۵۰ — بے خور و خوابی سے ہو کر[٥] سینہ ریش

سب نے[٦] اُس خود رفتہ سے جا کر کہا — یاں نہیں ہے مصلحت رہنا ترا

چین اپنا بھی ہمیں مطلوب ہے — یاں سے اُٹھ[٧] جانا ہی تیرا خوب ہے

---

١ بس۔ م ٢ س۔ کوئی نہ تھا جز نالہ اور اس کا رفیق۔ ٣ سے۔ ع۔ م۔
٤ ہوا۔ م ٥ ہو گئے۔ م۔ ٦ ر۔ اس دل شیدا سے یہ جا کر کہا۔
٧ ٹل جانا۔ م۔

اُس محلہ سے اُسے کیا کام تھا — کوئی واں[1] نے موجبِ آرام تھا

اُٹھ چلا پہلوئے دل سے مثلِ آہ — سانحہ تھا لیکن وہی روزِ سیاہ

چشم سے جاری تھا خونابِ جگر — لختِ دل مژگاں پہ جوں گلبرگِ تر

سوزِ دل سے اُس کی جو گفتار تھی — سو[2] فقط یک آہِ آتشبار تھی

دیکھ دلچسپ یک درختِ سایہ دار — واں لیا اُس خانہ ویراں نے قرار

پر کرے کیا دل کی بیتابی کو وہ — بیخودی کو اور بے خوابی کو وہ

بسکہ تھا سرگرمِ افغاں روز و شب — واں بھی ہمسائے ہوئے[3] آزردہ سب

درپئے ایذا ہوئے پیر و جواں — ۶۰ تا کرے اس جا سے یہ نقلِ مکاں

الغرض یونہی وہ محنت آشنا — بے سروپا شہر میں پھرنے[4] لگا

پر زیادہ تین دن سے زینہار — ایک جاگہ[5] بھی نہ پاتا وہ قرار

جس جگہ جاتا تھا وہ افسردہ دل — اس سے سب ہوتے[6] تھے واں آزردہ دل

گر کوئی آزردہ یا خوش اُس سے ہو — تھی کسی سے کچھ نہ اُس کو گفتگو

---

[1] ر۔ واں نہ کوئی اس کا دل آرام تھا۔ [2] ہاں مگر...... ر۔ [3] آزردہ ہوئے ہمسائے سب۔ ر۔ [4] ساری ہوا۔ ر۔ [5] ایکہ جا کرنے نہ پایا... ر [6] ہوتے تھے وہاں اندوہ دل۔ ر۔

[۱] شہر میں اس شدت سے تھا شورِ جنوں ۔ اشک نے پیدا کیا تھا رنگِ خوں

رنج میں نت جانِ غم فرسودہ تھی ۔ لب پہ ہر دم آہِ خوں آلودہ تھی [۲]

پھر تو باہم مل کے سب خورد و کلاں ۔ جان کر دیوانۂ بے خانماں

جس سے جو آزار پہنچا پا گیا ۔ سر پہ اُس شیدا کے سب آیا گیا

سنگِ طفلاں سے بدن تھا خونچکاں ۔ قد تھا اُس کا رشکِ نخلِ[۳] ارغواں

جس طرف جاتا دلِ پُر یاس سے ۔ ۷ ۔ بھاگتی تھی خلق اُس کے پاس سے

[۴] نے کہیں رکھتا تھا منزل نے مقام ۔ شب وہیں کاٹی جہاں کی[۵] اُس نے شام

جس جگہ بیٹھا برنگِ نقشِ پا ۔ واں سے اُٹھنا اُس کا[۶] پھر مشکل ہوا

تھا وہی آہ و فغاں اُس کا شعار ۔ تھا وہی دل ساتھ اُس کے بیقرار

روز و شب زاری[۷] سے اُس کو کام تھا ۔ گو کہ سارا شہر بے آرام تھا

دیکھ کر ایسا اُسے بے نام و ننگ ۔ [۸] ہو گئے پیر و جواں جاں سے بہ تنگ

---

۱ ر میں شعر ندارد۔ ۲ ر میں یہ شعر اضافہ ہے۔ ۳ باغ۔ م۔

۴ نا۔ م۔ ۵ ہو اس کو شام۔ ر۔ ۶ کو۔ ر۔ ۷ رونے میں۔ ر۔

۸ خلق نے یک بار ہو جانے سے تنگ۔ ر۔

بولے باصد خشم اُس دیوانہ سے | آفت و رنج و بلا ہمخانہ سے
جا کے باہر شہر کے اے بد معاش | کہ کسی جا گہ مقرر بود و باش
نالہ و افغاں سے تیرے روز و شب | یک جہاں ہے تنگ اور جاں بہ لب
زیست کا یہ کونسا اسلوب ہے | مرگ ایسی زندگی سے خوب ہے
الغرض یاں تک ہوئے سرگرمِ قہر[1] | آخرش اُس کو کیا بیرونِ[2] شہر ۸۰
وہ جو تھے دربان دربرِ شہر کے | بانیِ[3] ظلم و مبانیِ قہر کے
کہہ دیا ان سے کہ یہ دل داغ آہ | شہر میں[5] آنے نہ پاوے زینہار
کر کے اُس خار دلی سے یوں فراغ | یہ تو آئے[4] گھر کو اپنے باغ باغ
واں ہوا دیوانہ وحشت زدہ | دشت پیما جوں غبار گرد باد
شہر[6] سے باہر ہوئی صحرا کی راہ | جادہ پیما ہے جنوں سرگرم آہ

## بیانِ فصلِ گل و بہارِ دشت و صحرا[7]

اتفاقاً اُن دنوں تھی فصلِ گل | بلبلوں کو تھا میسر وصلِ گل

---

١ یہ کہا لاچار ... ر ٢ بیروں ۔ ر ٣ موجد و مبداءِ ظلم ۔ ر ٤ پھر تو آئے ۔ ر
٥ میں ۔ م ٦ ا میں یہ شعر اوپر کے شعر سے پہلے ہے ٧ عنوان کسی نسخے میں نہیں صرف م میں ہے

زور کیفیت سے آئی تھی بہار — مژدہ دیوانوں کو لائی تھی بہار

سبز و خورم ہر خس و خاشاک تھا — صحن صحرا گنبدِ افلاک تھا

تھا زمرد گوں لبِ دامِ غزال — قطعۂ مخمل[1] میں آبِ جوئبار

کوہ اور صحرا سے لے تا دشتِ گل ۹۰ — تھی ہر اک تختہ پہ مشق[2] خطِ گل

بسکہ تھا مبذولِ الطافِ بہار — رشکِ گلزارِ ارم تھا خارزار

سبزہ و دلکش ہیں تھا یوں[3] آبِ رود — چرخ پر ہو کہکشاں جیسے نمود

خندۂ گل یک طرف تھا ناز سے — نالۂ بلبل تھا سو انداز سے

تھی کہیں جعدِ بنفشہ زیبِ دوش[4] — قطرۂ شبنم کہیں تھا درِ گوش

چشمِ نرگس یا ہمہ[5] جوشِ خمار — مستئ[6] دوشیں سے یکسو شرمسار

تھی پریشاں زلفِ سنبل کی کہیں — چاک تا دامن قبا گل کی کہیں

سرو تھا یکجا قد[7] آزاد سے — قمریوں کو کام تھا فریاد سے

لالۂ خونیں کفن نے یک طرف — داغ سے باندھی تھی ایک محشر کی صف

---

۱؎ قطعہ مخمل میں تھا، سارے مخطوطات۔ ۲؎ ہوتی مشق گل۔ س ۳؎ یوں تھا۔ ا۔ ع اب جمود۔ ر ۴؎ جوش۔ ع ۵؎ تھی کہیں مست۔ س۔ بہار۔ م ۶؎ یک طرف خمیازہ کش لیل و نہار۔ ر ۷؎ ذرا۔ م۔

تھی کہیں شمشاد نے کی سرکشی ۔۔۔ ارغواں نے دشت کو تھی آگ دی

بہرِ سبزانِ چمن[1] ہر صبح و شام ۔۔۔ ۱۰۰ دھوتی تھی شبنم عقیقِ گل کے جام

پھکی پھرتی تھی نسیم[2] آبِ جو ۔۔۔ مثلِ مستاں[3] بے تکلف چارسو

سطحِ[4] آئینہ تھا سنگِ آبشار ۔۔۔ مست قہقہہ تھے تدرو کوہسار

جست آموزی غزالوں کی[5] کہیں ۔۔۔ بلبلوں کو مشق نالوں کی کہیں

یک طرف کبکوں[6] کو تھا شوقِ خرام ۔۔۔ رقص سے یکجا تھا طاؤسوں کو کام

فاختہ با کسوتِ خاکستری ۔۔۔ وجد میں آ کرتی تھی نوحہ گری

ہے مثل مشہور سب ہشیار و مست ۔۔۔ کہتے ہیں دیوانہ راہوئے بس است

دیکھ دیوانے نے یہ صحرا کا جوش ۔۔۔ بے تحاشا کر اٹھا[7] دل سے خروش

پھر تو کی شورش جنوں نے اس قدر ۔۔۔ فصلِ گل کی بھی نہ تھی اس کو خبر

ہم فغاں ہوتا تھا بلبل سے کبھی[8] ۔۔۔ جا الجھتا زلفِ سنبل سے کبھی[9]

روتا[10] قمری کی گہے فریاد سے ۔۔۔ ۱۱۰ گہہ بگڑتا تھا قدِ شمشاد سے

---

[1] ر۔ شعر ندارد [2] نشیمیں۔ ا۔ ر۔ م [3] ر۔ مست قہقہہ تھی تدرو ایک سو۔
[4] ر۔ شعر ندارد [5] باشے کو بھی تھی۔ ر [6] سب کو تھا شوق۔ م۔ ع۔ بگلوں ع
[7] کرتا تھا۔ م۔ ش [8] [9] گہے۔ م۔ [10] بحث ا، م

شورِ طاؤساں سے گھبراتا کبھی　　　بات[۱] کے کھڑکے سے ڈر جاتا کبھی

نالہ آموزِ عندلیبوں کا تھا گہہ　　　گاہ تھا آبِ رواں کا سدرہ

ہم زبانی اُس کو گہہ سوسن سے تھی　　　گاہ نرگس سے بندھی تھی ٹکٹکی

داغِ لالہ پر کہیں[۲] ہوتا تھا سوخت　　　چاک گل کا تھا کبھی سرگرم دوخت

دیکھ کر غنچوں کو خون دل میں تر　　　غنچہ ساں کھاتا تھا گہہ خونِ جگر

خندۂ گل پر کبھی روتا تھا زار　　　گریۂ شبنم پہ ہنستا بے شمار

آبجو سے تھا کہیں[۳] چیں بر جبیں　　　فاختہ کا مانعِ نوحہ کہیں

وحشیوں سے اُنس تھا گاہے بہم　　　گاہ تھا سایہ سے اپنے اُس کو رم

کثرتِ وحشت سے گہہ وہ دشت گرد　　　تھا بگولے کی نمط[۴] صحرا نورد

دشت کو گھیرا دیا تھا خاک سے　　　۱۲۰　　　تھی زمیں کو گفتگو افلاک سے

وسعت اتنی ہو جب وحشت کا رنگ[۵]　　　دامن[۶] صحرا نہ ہو پھر کیونکہ تنگ

تھا جنوں میں گرچہ نو مشقِ خرام　　　پر اُڑا دی خاک صحرا کی تمام

---

۱ بات کی گھڑکی سے ڈر ۔ ر ۔ ۲ کبھی ۔ م ۔ ع ۳ کبھی ۔ م ۔ ع ۔ ۴ طرح ۔ ر ۔

۵ تنگ ۔ م ، ننگ ۔ ا ۔ ر ۔ ۶ ہو پھر کیونکہ نہ تنگ ۔ م ۔

# آغازِ داستاں صحرا رَوانہ شُدن[1]

اتفاقاً ایک دن وہ نامراد
بادیہ پیما تھا مثلِ گردباد

ناگہاں یک سمت کتنے یک شجر
سبز و سایہ دار اُسے آئے نظر

برق ساں[2] یک مرتبہ بیتاب ہو
بے قرارانہ چلا یک سمت کو

جذبے[3] یک دم میں پہنچایا وہاں
دیکھا زور یک دلکش و خرم مکاں

تھی ہوا از بسکہ سرد و جاں فزا
دل وہاں بے اختیار اس کا لگا

انس کچھ اُس جا سے یہ[4] پہنچا بہم
واں سے مشکل ہو گیا اُٹھنا قدم

واں تو حضرت عشق[5] تھے گسترده دام
شیرِ گردوں کو نہ تھا تابِ خرام

اور بھی اُس خاک میں پنہاں تھا سحر
پائے[6] دل اُس کا کوئی اٹھتا تھا پھر ۱۳۰

عشق ہیں جس پاس یہ تشریف لائیں
شرطِ اول ہے کہ جی اس کا گنوائیں

---

۱؎ عنوان صرف م میں ۲؎ سا - م ع میں شعر نہیں ہے ۳؎ نیں ع 'پہنچایا یک دم - ع - ر میں مصرعہ یوں ہے :- جذبۂ وحشت سے پہنچا دم وہاں -
۴؎ مستی - م ۵؎ یہ - ر ۶؎ دامن - ر -

آپ[1] جس کے آشنا یک دم کے ہوں ۔۔۔ باعث اُس کے لاکھ جا ماتم کے ہوں

ہیں غرض[2] کوئی ز دو ہی فرات شریف ۔۔۔ جتنے[3] ہیں دلچسپ اُتنے ہیں حریف

الغرض وہ وحشیٔ آزردہ دل ۔۔۔ ہو کمالِ بے خودی سے پا بہ گِل

گر کے یک سایہ کے نیچے سو گیا ۔۔۔ کچھ تسلی سا دل اُس کا ہو گیا

حالت دل یہ ہوئی جب اُس[4] پہ فاش ۔۔۔ کی اُسی جا گہ مقرر بود و باش

جرم وحشت سے ہوا جس شہر سے ۔۔۔ تھا یہ خارج اُس ستم اور قہر سے

یہ مکاں تھا اُس سے یک فرسنگ پر ۔۔۔ لیک کچھ اُس سے ہوا نزدیک تر

دیکھ جائے دلکش و نزدیک راہ ۔۔۔ یک پریشاں حال نے[4] کھودا ایک چاہ

روز و شب تھا[5] اپنا یاں مسکن کیا ۔۔۔ ۱۴۰ ۔۔۔ رفع عشرت کے لئے یہ فن کیا

جو مسافر شہر سے جاتا کہیں ۔۔۔ پہلے وہ آ کر ٹھہرتا تھا یہیں[6]

یا کہ آتا شہر کو کوئی غریب ۔۔۔ رنج کش محنت[7] قرینِ آفت نصیب

دیکھ آب سرد جائے سایہ دار ۔۔۔ بیٹھ جاتا تھا وہاں[8] بے اختیار

---

[1] ا۔ ر اور ع۔ م میں یہ مصرعہ یوں ہے: خشکیِ لب آشنا یک دم کے ہوں [2] کچھ۔ ع

[3] واہ جب دلچسپ اتنا ہو حریف۔ ا۔ ر۔ ع [4] م۔ نے ندارد [5] وہاں اپنا کیا۔ م

[6] وہیں ر۔ م [7] نشیں۔ م [8] یہاں۔ ا۔ ر۔ ع۔

بسکہ جا[1] ہر طبع کی مرغوب تھی
اس گدا کی بھی گزرتی خوب تھی

جب[2] کئی دن گزرے دیوانہ کو واں
ایک جا بیٹھے ہوئے بے آب و ناں

وہ جو رہتا تھا فقیر خستہ حال
کر کے کوئی غربت[3] زدہ اسکو خیال

آ کے استفسار حال اُس سے[4] کیا
دیر تک یک قیل و قال اُس سے[5] کیا

جس قدر کوشش کی اُس درویش نے
کچھ کہا مطلق نہ اس دلریش نے

تب تو وہ سمجھا کہ دیوانہ ہے یہ
عقل سے یک لخت بیگانہ ہے یہ

نرگسِ فتاں کسی مے نوش کی
ہو گئی غارت گر اس کے[6] ہوش کی ۱۵

ہے پریشاں[8] کوئی زلف مشکناب
خانۂ دل جس[7] سے اُس کا ہے خراب

ہے[9] کوئی ترچھی نگہ جی میں کھبی
یا کوئی کافر پلک جی میں چبھی

کشتہ کس چشم سیاہ کا ہے یہ آہ
اشک ہے جس کے تصور[10] سے سیاہ

کون اُس کا مانع آرام ہے
صبح عیش اُس کی جو ایسی شام ہے

جان کر درویش نے[11] مہجور یار
مغتنم سمجھا اسے قرب[12] دیار

---

۱ مشہور۔ م ۲ گزرے دیوانے کو جب کئی دن وہاں۔ ر ۳ بے وطن اس کا۔ م ۴ کہ نے ر
۵ بے ہوش۔ م ۶ م میں یہ شعر پہلے ہے ۷ خانہ صبر ا جادہ صبر ر جا صبر ع۔
۹ کوئی نگہ ترچھی ہے جی میں کھپ گئی۔ ر ۱۰ نے میں۔ م ۱۱ ہے۔ ر ۱۲ جوار ا ع۔ ر۔

بسکہ تنہائی سے تھا حد[۱] جاں بلب — دل سے تھا مصروف خدمت روز و شب

تا کوئی دلچسپ ایسی بات ہو — صبح عشرت اس کے[۲] غم کی رات ہو

یک چلے ایسی نسیم جاں فزا — غنچۂ دل اُس کا تا ہو جائے[۳] وا

پر نہ سمجھا[۴] عشق کے اسرار کو — اس بلا انگیز تازہ کار کو

گرچہ غمخوار دل دیوانہ تھا — ۱۶۰ انقباض دل کو پر سمجھا نہ تھا

غنچگی میں ہے تو ٹک[۵] یک خیر ہے — ورنہ واشد میں تو اور ہی سیر ہے

ایک دلتنگی کو غنچہ رو گیا — گُل تو کھلتے ہی پریشاں ہو گیا

بارے[۶] بعد از چند ہی صبح و مسا — کچھ افاقہ اُس کو وحشت سے ہوا

ہوش میں یہ[۷] آپ کو پانے لگا — عقل[۸] کو کچھ کام فرمانے لگا

یہ تمنا دیکھ یوں[۹] پر متصل — خوش ہوا بے حد فقیر سادہ[۱۰] دل

لیک غافل عشق کے نیرنگ سے — بے خبر اُس کی گریز و جنگ سے

---

[۱] وہ ۔ م ۔ [۲] جس سے اُس ۔ م ۔ [۳] ٹک ہووے ۔ ا ۔ ذرا ۔ ر [۴] تھا ۔ م ۔ ر میں شعر نہیں ہے ۔ [۵] یک ہی ۔ م ۔ [۶] بعد بارے ۔ ع ۔ [۷] وہ ۔ ر ۔ [۸] کے متیں ۔ ر ۔ [۹] دل ۔ ر ۔ [۱۰] شاد ۔ م ۔

وہاں تو یہ خونریز تکتا گھات تھا — چاہتا ظالم یہی تو بات تھا

ایک بھی ہفتہ نہ گزرا تھا اُسے[۱] — بیخودی سے آپ میں آئے ہوئے

ساتھ[۲] اُس کے سر پہ یہ کالے پڑے — جان کے یک بارگی لالے پڑے

## آغازِ داستان[۳] دوچار شدن ہر دو

کرکے عزم سیر دخت[۴] شہریار ۱۷۰ — آفتِ دوراں بلائے روزگار

نکلی تھی با دامِ زلفِ پُرشکن — کرنے تسخیر غزالانِ ختن

وحشیوں کو سینکڑوں انداز سے[۵] — صید کرتی تھی کمندِ ناز سے

محوِ[۶] نظارہ ہوا آہو صف بہ صف — تھے شہادت خواہ ہر یک سر بکف

دی[۷] ادا کو رخصتِ صید افگنی — جان پر ہر بے زباں کے آ بنی[۸]

کشتہ کوئی خنجرِ مژگاں سے تھا — کوئی[۹] دلدادہ گرفتہ جاں سے تھا

---

۱ آئی تھی گویا آپ سے ۔م۔ ۲ ساتھی یہ دن سر پہ آ۔ ا۔ س۔ ع۔ ۳ ا۔ س۔ عنوان ندارد اور ع محض آغاز داستان۔ ۴ سیر وحشت شہر دیار۔ ۵ ع میں یہ صفحہ ۱۱۹ ہے۔ ۶ ہوا و اگر۔ س۔ ۷ پھر۔ س۔ الفاظ میں تقدیم و تاخیر ہے ۸ دل شدہ کوئی سیر اپنی۔ س۔

تھا کوئی[1] تیغِ تغافل کا شکار | تھا کہیں تیرِ[2] نگہ چھاتی کے پار

عشوۂ[3] خونریزی کا مائل تھا کہیں | لوٹتا غمزہ کا گھائل تھا کہیں

رُو کیا تیرِ نگہ نے ٹک[4] جدھر | تھا غزالوں کا وہاں سینہ سپر

جس طرف وہ[5] باخدنگِ ناز تھا | صید کوسوں فرشِ پا انداز تھا

ناوک[6] بیداد پھرے جس طرف | سینکڑوں تھے بے زباں اُس کے ہدف ۱۸۰

زخم جس کو تیغِ[7] ابرو سے لگا | واسطے قاتل کے تھا دستِ دُعا

صبح سے یک شورِ گیر و دار تھا | گرم ہر سُو موت کا بازار تھا

بے[8] گناہوں کے لہو سے وہ زمیں | ہو گئی تھی رشکِ فردوسِ بریں

تھا کھڑا شمشاد یک سو منفعل | سرو تھا حیرت سے یک جا پا بہ گِل

خونِ دل تھا مارتا غنچوں سے جوش | سو[9] زباں داری پہ سوسن تھی خموش

ایسی آفت سے کسی کا کیا چلے | تھیں[10] وہاں نرگس کی بھی آنکھیں تلے

---

۱ تھی۔ ا۔ ر۔ ع۔ ۲ سبیل۔ ا۔ ر۔ ع۔ ۳ ع شعر واضح نہیں ۴ جو۔ م۔ ع۔ شعر ندارد۔ ۵ وہ۔ ر۔ ۶ ع۔ شعر ندارد۔ ۷ کے۔ ا، ر۔ ۸ خون سے ہر بے گنہ کے۔ ر ۹ اس۔ ا، ب، ع۔ ۱۰ تھی۔ م۔

اس میں پہنچا مہر بھی بین السما — اعتدال[۱] طبع سے گزری ہوا

تھی جو سفاکی پہ وہ رشک پری — مائل خونریزی و غارت گری

تابش خورشید سے بیتاب ہو — بے قرارانہ کیا رو شہر کو

ہو نگاہ گرم جس عارض پہ بار — ۱۹۰ تاب خور سے ہو نہ کیونکر بے قرار

گرم[۲] قطع راہ ہوئی جوں آفتاب — ہم عناں آفت قیامت ہمرکاب

راہ میں تھا وہ مکان بے نظیر[۴] — سرد و سایہ دار و دلکش دلپذیر[۳]

جس جگہ تھا وہ فقیر نامراد — ہوش میں آنے[۵] سے دیوانے کے شاد

پہنچی جس دم[۶] وہاں یہ سر تا پائے ناز — ہر ادا رکھتی تھی جس[۷] سے سو نیاز

یوں حرارت سے عرق کے بیچ تر — آب میں جس طرح ڈوبا ہو گہر

دیکھتے ہی وہ مکان سایہ دار — کھل گیا یکبارگی دل غنچہ وار

اور تھے خدام جتنے گرد و پیش — شدت خور[۸] سے سبھی تھے سینہ ریش

---

۱ گرمی یکباری بہ شدت ہوئی وہاں۔ ر۔ ۲ جلوہ فرما ہو وہ رشک۔ ر

۳ دلپذیر۔ ر ۴ بے نظیر۔ ر ۵ اپنے دیوانے کے وہ شاد۔ م ۶ وہاں جس دم۔ ر

۷ جس کی۔ ر۔ ۸ خورشید۔ ع۔

بسکہ تھا گرمی سے یک عالم بجاں ۔۔۔ جانا ہر یک نے غنیمت وہ مکاں

ٹھیری[1] بہ یک دم یہاں دم لیجیے ۔۔۔ کوئی ساعت استراحت کیجیے

تا کہ ہو شدت ہوا کی اس میں کم ۔۔۔ چلیے پھر ڈیرے کو بے تشویش و غم ٢٠٠

دیکھیو ٹک[2] حیلہ سازی عشق کی ۔۔۔ دیکھیو نیرنگ بازی عشق کی

گھاٹ تھے[3] ہی میں وہاں تو یہ بے باک تھا ۔۔۔ ڈھونڈھتا تھا جو ہی یہ سفاک تھا

لا رکھا چنڈول اس کافر کا وہاں ۔۔۔ تھا جہاں[4] وہ وحشی بے خانماں

متصل ہی ایک سائے کے تلے ۔۔۔ تھا پڑا ہوتے ہیں[5] جیسے دل جلے

گاہ تھا شکوہ دل پر درد سے ۔۔۔ گہہ گلہ تھا اس کو آہ[6] سرد سے

بخت بد سے تھا کبھی سرگرم جنگ ۔۔۔ گاہ تھا خاموش وہ بے نام و ننگ

ناگہاں اودھی بلائے جاں گسل ۔۔۔ ہو گئی غارت گر اقلیم دل

بسکہ تھی دلکش بہ شدت واں ہوا ۔۔۔ اڑ گیا پردہ کہیں چنڈول کا

بے تکلف وہ بلائے روزگار ۔۔۔ ہو گئی اس دل جلے سے چشم چار

---

١ ٹھیریے - ر - ع - م - ٢ یہ - م - ٣ گھاٹ میں ہی - م - ٤ وہاں - م

٥ سینے میں - م - ٦ گرم و سرد - ر -

جوں نظر اُس کی نظر سے وہاں لڑی ۲۱۰ خرمن جاں پر وہاں بجلی پڑی

تھی نگہ یا ناوک خونخوار تھی آنکھ کے ملتے ہی دل کے پار تھی

کی سپاہ درد نے لشکر کشی ہو گیا تاراج ملک سرخوشی

کشت دل پامال فوج غم نے کی چہرہ پوشی خاطر خرم نے کی

شعلہ کھینچا آتش جانکاہ نے سرکشی کی نونہال آہ نے

طوف لب نالے وہیں کرنے لگے جیب داماں لخت دل بھرنے لگے

عقل[1] و دیں کی ہو گئی[2] زورق تباہ صبر و طاقت نے لی اپنی راہ

جیب و دست عشق میں ہاں بے حجاب لاگا یک یک تار کا ہونے حساب

بسکہ وہ مہر سپہر دلبری ہر[3] ادا تھی جس کی سحر سامری

بسکہ جام حسن سے سرشار تھی پھر نگہ اس سمت اس کو عار تھی

پھر کیونکر[4] اس پہ ہو اس ماہ کو ۲۲۰ کیا تناسب ہے گدا سے شاہ کو

کب غرور حسن کو ہے یہ دماغ خود نمائی سے کہاں اُس کو فراغ

---

[1] و ۔ ر ۔ [2] زورق عقل و خرد ہو گئی تباہ ۔ ر ۔ [3] م ۔ شعر ندارد

[4] کیونکر نسبت ہو ۔ م ۔

زخم کو عاشق کے تا دے[1] التیام ‏— جز نمک پاشی نہیں ہے اُس کا کام

یہ تو[2] ضعف تن سے وہ نخچیر تھا ‏— ترکیا جس نے نہ کام تیر تھا

صید لاغر کو اٹھا کر خاک سے ‏— ننگ سمجھے باندھنا فتراک سے

چھوڑ کر جوں غنچہ خونِ دل میں تر ‏— اُس گرفتہ دل کو پا سے تا بہ سر

حکم فرمایا سواری کو کہ ہاں ‏— ہو شتابی شہر کی جانب رواں

وہ چلی وہاں صبر یہاں اس سے چلا ‏— ہو گیا راز نہفتہ برملا

ضبط چاہا اُس نے بہتیرا کرے ‏— سلگے پنہاں[3] مثل اخگر اور مرے

پر گماں تھا یہ کوئی امکان تھا ‏— ضبط ایسا دل کا کیا آسان تھا

آہ دل سے کھینچ کر بے اختیار ‏— ۲۳۰ ‏— ہو لیا ہمراہ مانند غبار

پاسِ شاہی اور گدائی پھر کہاں ‏— یوں ہوا گویا وہ بے نام و نشاں

کہ اے وفا دشمن یہ کیا آئین ہے ‏— نامسلماں کونسا یہ دین ہے

یک نگہ کے واسطے منہ موڑیے ‏— صید کیجے اور بسمل چھوڑیے

خوں سے جب عاشق کی رنگیں خاک ہو ‏— کیوں نہ کیجے سرخرو فتراک کو

---

۱ دینا ۔م ۔ ۲ اتنا ۔م ۔ ۳ مینا ۔م ۔

اتنی کیوں اس ناتواں سے عار[1] ہے | میل شعلہ کو تو سوئے خار ہے

رکھتی ہے حالانکہ[2] مجھ پہ چشم تیغ | یک نگہ ناز[3] اس پہ کرتی ہے دریغ

ہے وفا سے دور اے غفلت شعار | تجھ سے امیدیں ابھی ہیں گی ہزار

یار جب تیرے[4] ہوا میں دوش کا | حق بجانب پھر ہے عقل و ہوش کا

تو ہی یک تنہا نہیں بیزار ہے | وقت بد میں کون کس کا یار ہے

۲۲. دیکھ کر مجھ ناتواں کو پایہ گل | دشمن جاں ہو گیا پہلو میں دل

صبر نے یک دست رو پنہاں کیا | ہے جواب صاف طاقت نے دیا

بے وفائی کی توانائی نے آہ | لی خرد نے جب سے آگے[5] اپنی راہ

یوں خوشی بھاگی دل ناکام سے | مرغ وحشی ہو رہا جوں دام سے

سرد مہری ہے ہر اک ہمدم نے کی | گرم جوشی ہاں مگر یک غم نے کی

گر نہ ہو سینہ پہ تیرے غم کا داغ | ہو چکا تھا کشور دل بے چراغ[6]

کرتی دلداری[7] آہ سرد ہے | مونس جاں ہے اگر تو درد ہے

---

۱ جان - م - ۲ غفلت پہ - م - ۳ تو مجھ پہ - م - ۴ تیرا جب - م -

۵ پہلے - م - ۶ بے خراب - م - ۷ یہ - م -

سوزِ دل کی جب گزر جاتی ہے حد — اشک دلسوزی سے کرتا ہے مدد

انس ہے یک آہ آتشبار سے — رابطہ ہے زخمِ دل افگار سے

وہ جو ہمدم ہم نفس ہمراہ ہے — سو فقط یک نالۂ جانکاہ ہے

زندگانی ہو گئی[1] جی کا وبال — ۲۵۰ — مرگ کا مانع ہوا تیرا خیال

ورنہ کرتی تھی وفا کب زندگی — ہے تصور سے ترے اب زندگی

سو تجھے صورت سے میری ننگ ہے — ننگ کیا ہے قتل کا آہنگ ہے

ڈر خدا کا بھی ہے کچھ اے سنگدل — کر زیادہ اب نہ مجھ کو تنگ دل

اور تو سب یک طرف لطف و کرم — یک نگہ سے کیا بھلا ہوتا ہے کم

شعلہ زن اتنی اے آتش خو نہ ہو — کام وہ کر جس میں رسوا تو نہ ہو

واسطے تیرے یک عالم کو نجوں — صبر اور طاقت کو ہمدم[2] چھوڑ دوں

دل میں ہو تیری وفاؤں کا خیال — سو ترا اے بیوفا ہووے یہ حال

مرگ کا آمادہ وہ بیمار ہو — جس کی بالیں پہ نہ[3] چشمِ یار ہو

زندگی کے یہ کہیں ہوتے ہیں ڈھنگ — نام سے میرے ہوا[4] جب تجھکو ننگ

---

[1] کی ہو لیا ہیں جن۔ا۔ر۔ع [2] سے۔ا۔ر [3] تو۔ع [4] تجھکو یہ۔م۔

انتہی غفلت اے[۱] جفا جو تا کجا ۲۶۰ کچھ جفا کا بھی ہے[۲] تیرے انتہا

انتہا ہر چیز کی[۳] ہے ہر کہیں دل کو جان اب صبر کی طاقت نہیں

سو بہانے لب تلک کرتی ہے آہ نالہ لیتا ہے خبر سو گاہ گاہ

آتشِ دل جو بجھاتا تھا مدام اشک بھی کرنے لگا روغن کا کام

نے کوئی ہمدم ہے اب نہ یار ہے نے کسی دلسوز[۴] اور غمخوار ہے

الغرض یہ دردِ دل کہتا ہوا سرزنش یک خلق[۵] کی سہتا ہوا

پہنچا در پر شہر کے با حال زار شورش[۶] دل سے نہایت بیقرار

گرچہ بیتابی[۷] تھی دل کو ہر گھڑی ہمرہی سے پر تسلی تھی بڑی

جوں سواری شہر میں داخل ہوئی اور ہی سر[۸] پر بلا نازل ہوئی

بسکہ یہ غم دیدہ سرتاپائے یاس تھا توجہ سے جنوں کی روشناس

شہر میں جانے کو دربانانِ شہر ۲۷۰ سد راہ اس کے ہوئے باخشم و قہر

جس قدر تڑپا[۹] کیا یہ نیم جاں رحم آیا ایک کو اس[۱۰] پر نہ وہاں

---

۱ جو کیا تو۔ م ۲ تیری بھی۔ م ۳ کا ۱۔ ر۔ ع ۴ اور سوز بجا۔ ر ۵ خلق۔ م

۶ سوزش۔ ا۔ ر۔ ع ۷ سیر لب تھی جاں۔ ا۔ ر۔ ع ۸ اُس۔ م ۹ تڑپتا۔ ا۔ ع ۱۰ ہرگز۔ م

مضطرب تب تو تپش سے دل کی ہو — گر نگاہِ یاس اک اُس[1] سمت کو

بولا[2] گو پہنچا نہ جسمِ ناتواں — ہے ترے ہمراہ یہ آزردہ جاں

بڑھ گئی اس میں سواری ٹک[3] جو دور — اور بھی بیکل ہوا یہ ناصبور

تھا درخت یک وہاں[4] نہایت ہی بلند — جس کی تھی ہر شاخ گردوں کی کمند

چڑھ گیا اُس پر کہ اور یک آدھ دم — دور سے ہی دیکھتا ہے مغتنم

دیکھتا تھا گرچہ وہ آفت قریں — ہر نگہ تھی پر نگاہِ واپسیں

جب تلک مدِ نظر تھا وہ غبار — میلِ بالا رکھتا تھا[5] یہ خاکسار

جوں ہوا اُس کی نظر سے وہ نہاں — پھر رہی اپنی خبر اس کو نہ یہاں

تھا شجر پر یا کہ[6] جوں پختہ ثمر — ۲۸۰ گرتے ہی تھا لاکھ ٹکڑے خاک پر

اشک کا قطرہ تھا گویا وہ جواں — نام چھٹ پایا نہ پھر جس کا نشاں

منہ سے جو[7] اُس نے کہی تھی آہ کی — دل تو تھا ہی جان بھی ہمراہ کی

بسکہ اُس درویش کو انس اس سے تھا — مضطرب ساتھ اُس کے آیا تھا لگا

دل میں کہتا تھا کہ بے ڈھب بات ہے — کی[8] دغا ظالم نے کیا ہیہات ہے

---

۱ وہ اک۔ م ۲ کیوں ... یہ جسم۔ م ۳ تب۔ م ۴ گئے ہے۔ م ۵ وہ۔ م
۶ چونکہ وہ۔ م ۷ اس نے جو۔ م ۸ کیا بری۔ و۔ م ع۔

خیر اب مجھ کو نہیں آتی نظر — کھیل بیٹھا ہے یہ اپنی جان پر

ناگہاں دیکھی جو اُس نے اُسکی لاش — خاک پر مانند مینا پاش پاش

ہو گیا تاریک آنکھوں میں جہاں — چشم سے دریائے خوں کر کے رواں

بولا وحشت ہی بھلی تھی کیا کہیں — ہوش کی تیرے تمنا تھی ہمیں

سو تجھے یہ کچھ سجھائی ہوش نے — کیا ہی بے ہوشی دکھائی ہوش نے

دیکھ کر درویش نے یہ ماجرا — ہو کے حیراں عشق کے نیرنگ کا ۲۹۰

واں سے اُٹھوا اُس جگر افگار کو — کشتۂ تیر نگاہِ یار کو

لے گیا اُس کو مکاں اوپر وہاں — آ کے وحشت میں یہ بیٹھا تھا جہاں

انس جس جاگہ سے تھا اُس نے کیا — پائے دل اُس کا نہ تھا اُٹھنے دیا

واں بنایا اُس ستم کش کا مزار — خاک میں سونپا دل امیدوار

پر نہ کرتا دفن تھا ساتھ اُسکے دل — نام کو دل تھا بلائے جاں گسل

گرچہ تھا سینہ میں جوں اخگر نہاں — راکھ میں ہو گیا یہ اخگر پہ نہاں

آتشِ دل ہے بجھائی کب یہ جائے — جب تلک ظالم نہ یک عالم جلائے

---

۱ کر کر۔ ۷۔ ۲ یاں۔ ا۔ ۷۔ ع۔ ۳ اپنے۔ ا۔ ع۔ م۔

خاک میں ہو گر نہ اس کو وصلِ یار — حشر تک عاشق کو رکھے بیقرار

واہ رے اے عشق نیرنگی تری — گہہ خوشی اور گاہ دلتنگی تری

یہاں کیا پیوند اُس کو خاک کا ۳۰۰ — دل وہاں پھیرا ہے اس سفاک کا

وہ بلائے جانِ اربابِ نیاز — اُتری تو دولت سرا میں آ بناز

پر دلِ نازک بزیرِ بارِ عشق — منکشف چہرہ پہ سب آثار[۲] عشق

ہر شکن اُس زلفِ عنبر فام کی — تھی گرہ پیشانیِ ناکام کی

شاد و خنداں یا تو مثلِ گل تھی وہ — یا کہ رشک افزائے صد بلبل تھی وہ

پر حیا از بسکہ دامن گیر تھی — بے صدا جوں بلبلِ تصویر تھی

گرچہ تھا شدت سے ضبطِ اضطرار — پر کوئی[۳] دل پر ہے اپنا اختیار

آہ آخر لب تلک آنے لگی — کیا ہی گرم و سرد دکھلانے لگی

رفتہ رفتہ اشک بھی خوں ہو گیا — یا تو یم تھا یا کہ جیحوں ہو گیا

ہمسری تھی گل سے حسنِ عارض کو ننگ — ہو گیا صد برگ کا وہ رشکِ رنگ

خوابِ ناز آلودہ ہر شب صبح تک ۳۱۰ — چشم میں کرنے لگا کارِ نمک

---

۱ پر - ا - ر - ع - ۲ آثار - ا - ع - ۳ نہیں - م -

فرشِ گل پر بے کلی سے زار تھی　　ہر رگِ گل اُس کو نوکِ خار تھی

گزرے اُس حالت سے جب دو چار روز　　بادمِ سرد اور آہِ سینہ سوز

دیکھی بے ڈھب عشق نے جب دل کی لاگ　　دی ہٹی[1] بھڑکا سینۂ سوزاں کی آگ

درد دل کی پھر تو طغیانی ہوئی　　کیسی طغیانی کہ دیوانی ہوئی

سوزِ پنہانی کی طاقت[2] پھر کہاں　　رازِ دل لائے[3] زباں پر شمع ساں

بولی جی شدت سے گھبراتا ہے آج　　خود بخود کچھ دم رکا جاتا ہے آج

ہول دل کا گرچہ تھا کب سے خلل　　پہ نہیں کل سے دلِ بے کل کو کل

کچھ نہیں کھلتا یہ[4] کیا اسرار ہے　　سانس لینی[5] آج تو دشوار ہے

قصرِ شاہی ہے سبھی زنداں مجھے　　خوش نہیں آتا رخِ خنداں مجھے

بیٹھوں ہوں گر باغ میں جا ایک دم　　۳۲　　وردہ تا دل کو ہوتا ہے الم

دیکھ واں بھی خندۂ گل بے نمک　　داغِ دل کرتا ہے پیدا ایک چمک

سوختہ کرتی اور سیرِ لالہ ہے　　شعلہ زن یک آتشِ جوالہ ہے

---

۱ وہیں بھڑکا دل۔ ر۔ ۲ پھر طاقت۔ م۔ ۳ ظاہر۔ ر۔
۴ ہے۔ م۔ ۵ لینا۔ ر۔

ڈر ہے مجھ کو مرغ جاں رک کر کہیں     دام ہستی سے نکل جاوے نہیں

سیر گل تو یہ دکھاتی ہے تعب [۱]     سیر صحرا ہاں مگر باقی ہے اب

کیجیے یک آدھ دم صحرا کی دید     قفل دل کی ہو یہی شاید کلید

جو خواصیں محرم راز اس کی تھیں     مونس جاں اور دمساز اس کی تھیں

ساتھ لے کر ان کو وہ آرام جاں     جانب صحرا ہوئی خوش دل رواں [۲]

لیلیٰ محمل نشیں مجنوں شعار     نکلی صحرا کی طرف بے اختیار

تھی تپش سے دل کی ایسی بے حواس     ڈر پدر کا تھا نہ مادر کا ہراس

ابر مژگاں یہ [۳] بلا خونبار تھا     ۳۳۰ جیب و داماں رشک صد گلزار تھا

پہنچی اس حالت [۴] سے وہ سرو رواں     کثرت بیتابی دل سے وہاں

---

۱ نسخہ ا، ۲ میں یہ تین شعر اضافہ ہیں :—

کیجیے صحرا کی چل کر آج سیر     پر میسر ہو اگر بے شرکت غیر

کیونکہ تنہائی مجھے بھاتی ہے آج     بجز مطلق خوش نہیں آتی ہے آج

میں کہوں جس جس کو سو یاں سے چلے     دل ہے گھبراتا مرا انبوہ سے

۲ ع میں اس شعر کے بعد عنوان کے طور پر داستان مندرج ہے۔ ۳ یہاں تک۔ ۴ عالم ۔ ۱، ۲

جس جگہ وہ کشتۂ تیغ نگاہ ‏ ‏ دیکھتا زیر زمیں تھا اس کی راہ

گرچہ یک مدت[1] سے بیہوشی میں تھا ‏ ‏ پر تمنائے ہم آغوشی میں تھا

رک گئی بیساختہ واں وہ نگار ‏ ‏ لیک بیتاب اور بشدت[2] بیقرار

سوچ اپنے کا نہ بیگانے کا تھا ‏ ‏ جاتے ہی دھیان اسکو دیوانے کا تھا

پایا غمگیں سا تھا کچھ درویش کو ‏ ‏ پر نہ دیکھا مطلق اُس دلریش[3] کو

بڑھ گیا سو حصہ دل کا اضطرار ‏ ‏ پھر[5] کہاں شرم اور کدھر صبر و قرار

بولی یوں یک جا دمہ سے بے حجاب ‏ ‏ پوچھ اُس درویش سے جاکر شتاب

آج وہ دیوانہ آفت قریں ‏ ‏ کیا سبب ہے جو نظر آتا نہیں

جوش وحشت ہیں مگر وہ مستمند ‏ ‏ ۳۴۰. اور کوئی دشت کر بیٹھا پسند

لاخبر اُس بے خبر از خویش کی ‏ ‏ سینہ چاک ہجراں بلب دلریش کی

دیکھ یوں اُس شمع رو کو بے قرار ‏ ‏ مضطرب یہاں سے[6] چلی وہ شعلہ دار

جا کے نام اُس دل جلے کا جوں لیا ‏ ‏ بے تحاشا اُس گدا نے رو دیا

---

۱؎ دن سے۔ ر ۲؎ بے شدت و۔ ع ۳؎ بیہوشش۔ م ۴؎ اس کے تئیں دونا ہوا اور ۵؎ ہے کہاں صبر اور کدھر شرم۔ م ۶؎ یہ۔ ع۔

اور کہا مت پوچھ اُس شیدا کا حال | زندگی ہو جائے گی ناحق وبال
وہ تو دیوانہ ہے ایسی کر گیا | تازہ پھر آئین قیسی کر گیا
یہ بلا سوجھی تھی اُس ناشاد کو | رشک شاید جس پہ ہو فرہاد کو
جب تلک اُس خستہ تن میں جی رہا | پاس ناموس محبت ہی رہا
جان دی پرشان اپنی رکھ گیا | واچھڑے کیا ان[1] اپنی رکھ گیا
سادگی سے وہ فقیر بے خبر | کہہ گیا روداد[2] سارا سربسر
پر نہ یہ اُس وقت بات[3] اُس تک چلی | ہے یہ پہنچی[4] ہوئی اُسی سفاک کی ۳۵۰
جس نے پوشش خاک کی اُس تن کو دی | آگ جس شعلہ نے اُس خرمن کو دی
کر کے سب اول سے آخر تک بیاں | اُس کی مرقد کا دیا اُس کو نشاں
سنتے ہی جوں برق یہ یہاں سے چلی | کیا چلی اور ایک آفت لے چلی
تھی یہ اُس درویش سے بھی سادہ[5] تر | چاشنی سے درد[6] کی حد بے خبر
یہ نہ سمجھی عشق کی گھاتیں ہیں یہ | اور نہ اُس خونریز کی باتیں ہیں یہ

---

[1] شان - م۔ [2] کہہ دیا روداد - م [3] تک - ا [4] پہنچی - م [5] دل - م -
[6] دل کی یہ حد بے خجل - م - [9] گیا - م -

یعنی وہ وحشت سرشت دشت گرد
ہو گیا ملک عدم کا رہ نورد

تھا خدا جانے حباب روئے آب
مٹ گیا یک آن میں مثل حباب

سامنے ہے یہ جو یک مشت غبار
ہے اسی شیدا کا یہ تازہ مزار

جوں سنی اس رشک مہ نے یہ خبر
رہ گئی حیراں منہ اس کا دیکھ کر

بعد کتنی دیر کے اپنے میں آ
بولی ظالم پھر تو کہہ یہ کیا کہا ۳۶۰

پھونکی کیا آتش یہ تو نے ہے غضب
جل گیا کاشانۂ دل جس سے سب

کر دیا غارت متاع صبر و تاب
ہو گیا قصر توانائی خراب

تھی مجال اس گفتگو کی پھر کسے
بات کی فرصت نہ دی دل نے اسے

بے کلی سے ایسی ہی گھبرا گئی
رک کے جاں اک دم ہی میں لب پر آ گئی

تج کے ننگ و نام سب بے اختیار
اتری ہے چنڈول سے دیوانہ وار

پھر کوئی روکے سے رکتی تھی وہ ماہ
گرچہ تھے انجم صفت سب سد راہ

اپنی بھی مطلق نہ تھی اس کو خبر
ہووے کس کو پاس ناموس پدر

---

۱ دم میں وہ۔ ا ع ج۔ ۲ جو۔ ا ع ج م ۳ ماہ۔ م ۴ کہ۔ م۔ ۵ تاب تھی اس گفتگو سے۔ م۔ ۶ لب پر ایک دم میں آ گئی۔ م ۷ چونڈول ا۔ ر۔ ع۔ ۸ سب انجم صفت تھے۔ ا۔ ر۔ ع ۹ بھی اس کو نہ تھی مطلق۔ ع۔

مضطرب افتاں و خیزاں برق وار — پہنچی اُس بیدل تلک حد بیقرار

گر کے یک آلودۂ حسرت نگاہ — گر پڑی[1] مرقد پہ اُس کی بھر کے آہ

خاک پر گرتے ہی بس اُس ماہ کے — جان بھی رخصت تھی ساتھ ہی آہ کے ۳۷۰

ہو گیا یک دم میں سب قصہ تمام — عشق نے آخر کیا[2] اپنا ہی کام

پھر کوئی آتا تھا دیوانہ کو صبر — شق ہوئی جوں سینۂ عاشق وہ قبر

دو[3] تو اپنی اپنی جاگہ سے چلے — کیا ہی بے کھٹکے گلے باہم ملے

لب بہ لب سینہ بہ سینہ زیر خاک — کیا ہی دلجمعی سے تھے باہم تپاک

کتنے وے[4] اُس جنس کے خواہاں تھے جو — نقد جاں پر مفت سمجھے وصل کو

ماجرا یہ دیکھ پاتے تا بہ فرق[5] — بحر حیرت میں ہوا درویش غرق

اور وہاں جتنے جوان و پیر تھے — دم بخود جوں پیکر تصویر تھے

مثل آئینہ ہر یک صاحب نظر — محو حیرانی[6] تھا پاسے تا بہ سر

پھر تو یک محشر وہاں برپا ہوا — شہر میں اس بات کا چرچا[7] ہوا

---

۱؎ کر۔ ع۔ ۲؎ ہی کا اپنا۔ ا۔ ب۔ ع ۳؎ ا۔ شعر ندارد ۴؎ یاں۔ م ۵؎ سر۔ م

۶؎ حیراں۔ م۔ ۷؎ شہرہ۔ ا۔ ب۔ ع۔

مادر اُس مہ کی یہ حالِ نوحہ گر[1] ۳۸۰ اور شاہ کامراں اُس کا پدر

چھوڑ کر[2] ایوانِ شاہی سینہ چاک ڈالتے دوڑے سروں پر اپنے خاک[3]

آکے دیکھا اور ہی عالم یہاں[4] نقشِ دیوارِ تحیر یک جہاں

ہر زباں کو تھی و لے تکرارِ عشق سب یہی کہتے تھے ہے یہ کارِ عشق

واقعی جس وقت کھدوایا اُنھیں شوق میں دست و بغل پایا اُنھیں

تھا ہم آغوشی کا یہ عالم بہم جوں رکھے چسپیدگی نقشِ درم

اِتنا ہر یک وصل کا مشتاق تھا یک سرِ مو فصل اُن پر شاق تھا

دیکھا[5] شاہ دادگر نے جب یہ حال عاشقِ صادق انھوں کو کر[6] خیال

جبر اپنی ہی حمیت پر کیا ایک جا باہم اُنھیں رہنے دیا

چھوڑ[7] دونوں کو بہم جوں شیر و قند کر دیا اُس گور کو پھر تختہ بند

واہ واہ اللہ رے[8] اللہ عشق ۳۹۰ کیا نیا و تازہ ہے اے واہ عشق

---

۱ باپ ماں اُس مہ کے با حالِ خراب چھوڑ کر ایوانِ شاہی کو شتاب۔ م

۲ ڈالتے دوڑے سروں پر اپنے خاک جاں بلب (و) دل کباب اور سینہ چاک۔ م

۳ نسخہ ع یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ ۴ ہے یہاں۔ م

۵ دیکھ کر یہ حال شاہِ دادگر۔ ۶ جان کر۔ م ۷ چھوڑ باہم ہمکنار ان کے تئیں
کر دیا بند اُس جگہ کو پھر وہیں۔ م ۸ ہی۔ ا۔ م

حسن کی غارت کا شکوہ ہر کہیں — اپنی خوں ریزی کا مذکور ہی نہیں

آ گیا جس جا شکوہ و شان پر — کھیلا وہاں معشوق اپنی جان پر

خاک میں ظالم ملایا آفتاب — اس پہ تپش[۱] کا ہو تری خانہ خراب

لطف بس چپ رہ کدھر کو دھیان ہے — یہ سخن تیرے نہیں شایان ہے

اس سے آگے ہو نہ اے غماز عشق — خوب ہے پوشیدہ رکھنا راز عشق

ختم کر بس شاعری کو اب یہیں — عشق[۲] ہی تیری طبیعت کا نہیں

شعر کا تو یہ نہیں انداز[۳] ہے — سحر کہیئے گر نہیں اعجاز ہے

معنیٔ روشن نہ سمجھے گر عدو — رکھنا مت اس کور باطن سے کبھو

یہ تو پوشیدہ نہیں ہے فاش ہے — خیرہ خور سے دیدہ خفاش ہے

کچھ بھی موقع تھا یہاں ذکر عدو .. ۴ — عشق کی کرتا ابھی تھا گفتگو

کس طرف سے جا رہا کیدھر گماں — نفس کافر لے گیا مجھ کو کہاں

لاکھ دشمن کا ہے دشمن یہ لعیں — خوں کی جس کے دیت مطلق نہیں

---

۱ کشش۔ ا۔ س۔ ۲ عشق ہے تیری طبیعت کے تئیں۔ م۔

۳ اعجاز۔ م۔

قید ماومن میں نت یہ بے ادب ۔۔۔ بے مزہ رکھتا ہے مجھکو روز و شب

ہے رہائی اس سے اب اس شہ کے ہات ۔۔۔ خیر سے سلماں کو دی جس نے نجات

یعنی حیدرؑ ابن عم مصطفےٰ[1] ۔۔۔ قاتل عنترؑ[2] علیؑ مرتضےٰ

ساقیٔ کوثر امام جزو کل ۔۔۔ شافع محشر گل[3] باغ سبل

صاحب افسر شہنشاہ نجف ۔۔۔ فاتح خیبر نشان من عرف

وارث منبر شہ گردوں مقام ۔۔۔ حیدر صفدر سپہر احترام

شاہ مرداں میر میدان وغا ۔۔۔ شیر یزداں نائب حکم خدا

لطف بس اب بے ادب آشنا نہ ہو ۴۱۰ ۔۔۔ منہ تو اپنا دیکھ اور یہ گفتگو

لائق انساں نہیں یہ قال و قیل ۴۱۱ ۔۔۔ ہے[4] جو مداح علیؑ بیاں جبرئیل[5]



[1] م میں مصرعوں کی تقدیم و تاخیر ہے۔ [2] عنتر و ادرم۔ اعدا۔ س۔
[3] امام جزو کل۔ م۔ [4] ہو۔ م۔ [5] تو۔ م۔

# مرتب کی دوسری تصانیف

۔ مہ لقا ۔ اردو کی اولین شاعرہ اور مشہور فنکارہ، ماہ لقا بائی چندا کی تحقیقی سوانح حیات اور اس کے کلام کا مجموعہ جو سارے ماخذوں سے اکٹھا کیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن) قیمت ۲ — ۵۰

۔ دیوان لطف ۔ دہلی کے مشہور شاعر، فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم اور "تذکرۂ گلشن ہند" کے مرتب، مرزا علی لطف کے کلام (غزلیات، قصاید وغیرہ) کا مجموعہ جو تلاش اور تحقیق سے سارے محصلہ ماخذوں سے اکٹھا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ لطف کی حیات پر ایک بسیط مقدمہ بھی شامل ہے۔ ۲ — ۵۰

۱ ۔ شکارنامہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ ۔ خواجہ صاحب کے اہم اردو رسالوں میں شامل ہے کئی مخطوطوں کی مدد سے متن مرتب کیا گیا ہے اور خواجہ صاحب کی حیات، عہد اور ان کے کارناموں پر ایک وسیع مقدمہ بھی شامل ہے۔ ۲ — ۰

۔ حیات لطف ۔ مرزا علی لطف کے حالاتِ زندگی ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے تھے پہلی دفعہ مستند ماخذوں سے ان کے حالات اور تصانیف کے بارے میں معلومات فراہم کر کے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ ۲ — ۰

۔ اردو کے کچھ ہندو شعراء ۔ اردو کے ہندو مصنفین اور شعراء پر اب تک جو تصانیف شائع ہو چکی ہیں ان کے علاوہ بعض کمیاب ماخذوں سے کئی ہندو شعرا کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، اس کتاب میں اکٹھی کر دی گئی ہیں (زیر طبع)

ان سخن ۔ غلام مصطفےٰ خاں سخن حیدرآباد کے سربرآوردہ اور نغز گو شاعر تھے ان کی

غزل میں رس اور قصیدہ میں زور موجود ہے۔ یہ دیوان سخن کی حیات اور شاعری پر ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ . . . . . . (زیر طبع)

۷۔ **کلامِ خرد** ۔ راجہ لچھمن لال خرد، وینکٹ گری کے رہنے والے تھے، لیکن اردو شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ مسجد والاجاہی کے لئے فارسی میں انہوں نے قطعہ تاریخ بھی لکھا تھا۔ ان کے حالات اور کلام کا مجموعہ۔ . . . . . (زیر طبع)

۸۔ **مثنویاتِ شاہ کمال** ۔ شاہ کمال مرتب تذکرہ "مجمع الانتخاب" کی دو مثنویاں جن میں سے ایک ان کی کنیا برفی کی موت پر اور ایک اپنے یالو کی ہجو میں لکھی گئی ہے۔ ابتداء میں مرتبہ کا کمال کی حیات اور شاعری پر عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے . . . . . . . . . . . . . . (زیر ترتیب)

۹۔ **مثنوی اکبر** ۔ اکبر علی خاں اکبر، لکھنؤ کے عمائدین میں سے تھے وہ حیدرآباد کے ناظم بھی رہے اپنے سفر اور حیدرآباد کے حالات پر انھوں کے ایک مثنوی لکھی تھی، جو مقدمہ کے ساتھ مرتب کی گئی ہے . . . . . . . . . . . . . (زیر طبع)

۱۰۔ **دیوانِ صفا** ۔ ذوالفقار علی خاں صفا، میر تقی میر کے برگزیدہ شاگردوں میں سے تھے۔ اُن کی مثنوی "چھو منتر" مشہور اور مقبول ہے۔ ان کا دیوان کمیاب تھا جسے مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے . . . . . . . . . . . (زیر طبع)

---

مجلس تحقیقاتِ اردو۔ حیدرآباد دکن
۳-۶-۶۸۸، حمایت نگر، حیدرآباد دکن

# مجلس تحقیقاتِ اردو حیدرآباد دکن کی مطبوعات

## اور زیرِ طبع کتابیں

۱۔ **شکار نامہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ**۔ حضرت گیسو درازؒ کے اردو رسالوں میں یہ متصوفانہ رسالہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے متن کو محترمہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت لکچرار اردو، زنانہ کالج عثمانیہ یونیورسٹی نے کئی مخطوطوں کی مدد سے مرتب کیا ہے ابتداء میں حضرت خواجہ صاحب کی حیات اور کارناموں پر ایک بسیط مقدمہ اور قدیم زبان پر لسانی نوٹ بھی شامل ہیں۔ . . . قیمت ۵۰ — ۱

۲۔ **کلمۃ الحقائق حضرت شاہ برہان الدین جانمؒ**۔ حضرت جانمؒ کا یہ متصوفانہ رسالہ اردو نثر کے ابتدائی رسالوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس رسالہ کو محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ریڈر اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کئی مخطوطوں سے مقابلے کے بعد مرتب کیا ہے۔ اور ایک بسیط مقدمہ بھی قلم بند کیا ہے۔ ۵۰ — ۱

۳۔ **مثنوئ لطف**۔ دہلی کے مشہور شاعر اور ادیب "تذکرہ گلشن ہند" کے مرتب، مرزا علی لطفؔ کی کمیاب مثنوی کو محترمہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے انجمن ترقی اردو علی گڑھ، رضا لائبریری رام پور مجلس تحقیقات اردو اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے نسخوں سے مقابلے کے بعد مرتب کیا ہے اور لطف کی زندگی اور کارناموں پر ایک بسیط اور عالمانہ مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ ۵۰ — ۲

۴۔ **فن اور فنکار**۔ محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے علمی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ۔ یہ مقالات اردو میں جدید تنقیدی شعور کے آئینہ دار ہیں۔ ۰ — ۴

۵۔ **دیوان لطف**۔ مرزا علی لطفؔ کی غزلیات قصائد اور دوسرے اصناف کلام کا مجموعہ جسے

محترمہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مخطوطہ دیوان کے علاوہ سارے معلومہ ماخذوں سے کلام اخذ کر کے مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں لطف کی حیات اور کارناموں پر عالمانہ اور محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ . . . . . . . . . قیمت ۳ — ۰

**۶۔ کلیات لطف** ۔ لطف کی مثنوی اور دیوان مرتبہ محترمہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت کو ان کی حیات کے ساتھ اکٹھا بھی شائع کیا گیا ہے۔ . . . . . . . قیمت ۹ — ۵۰

**۷۔ حیات لطف** ۔ مرتبہ محترمہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت۔ کلیات سے علیحدہ بھی شائع کی گئی ہے۔ . . . . . . . . . . قیمت ۱ — ۵۰

**۸۔ اقبال سخن** ۔ اقبال کے عہد بعہد کلام کا انتخاب جس کے ساتھ ایک سیر حاصل مقدمہ بھی محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے قلمبند کیا ہے۔ قیمت ۱ — ۵۰

## زیر طبع اور زیر ترتیب کتب

**۱۔ قصۂ ملکۂ مصر** ۔ قدیم شاعر محمد علی عاجز کے مشہور قصے کو جناب صفی الدین محمد ام۔ اے لکچرار گیرراج کالج نظام آباد (اے۔پی) نے کئی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے اور ابتدا میں ایک بسیط عالمانہ اور محققانہ مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس میں مصنف کے نام اور قصہ کے سنہ تصنیف کے بارے میں بہت غلط فہمیوں کو رفع کیا ہے۔ . . . . قیمت (زیر طبع)

**۲۔ لسانی مطالعے** ۔ محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے زبان اور لسانیات سے متعلق مقالات کا مجموعہ . . . . . . . . . . . (زیر طبع)

**۳۔ اُردو ادب میں خواتین کا حصہ** ۔ محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا تحقیقی کارنامہ جس میں مختلف اصناف میں خواتین کے کارناموں پر تلاش و تحقیق سے مواد فراہم کیا گیا ہے۔ . . . . . . . . . (زیر طبع)

۴ - دیوانِ سخن - غلام مصطفےٰ خاں سخن، حیدرآباد کے بڑے نغز گفتار شاعر تھے۔ اُن کے قطعات اس زمانے کے تاریخی واقعات کا بھی خزانہ ہیں۔ یہ دیوان محترمہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے سخن کی حیات اور شاعری پر بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ (زیرِ طبع)

۵ - مثنویاتِ شاہ کمال - شاہ کمال مرتب تذکرہ "مجمع الانتخاب" کی دو مثنویوں کو محترمہ ثمینہ شوکت نے کمال کی حیات اور کارناموں پر مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ . . . . . . . . . . . (زیرِ طبع)

۶ - دیوانِ صفا - ذوالفقار علی خاں صفا، میر کے تلامذہ میں سربرآوردہ حیثیت رکھتے ہیں، ان کی مثنوی "چھو منتر" مشہور اور مقبول ہے لیکن اُن کے دیوان کے نسخے کمیاب ہیں۔ محترمہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے دیوان کو مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے (زیرِ طبع)

۷ - کلامِ خرد - راجہ لچھمن لال خرد وینکٹ گری کے باشندہ تھے وہ حیدرآباد میں بھی رہے اور والا جاہی حکمرانوں سے بھی اُن کا توسل رہا۔ مسجد والا جاہی کی تعمیر کے موقع پر انہوں نے ایک فارسی قطعہ تاریخ بھی کہا تھا۔ ان کا اردو کلام کمیاب ہے اس کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ . . . . . . (زیرِ طبع)

۸ - مثنوی اکبر - اکبر علی خاں اکبر، لکھنؤ کے عمائدین میں سے تھے وہ حیدرآباد آگئے تھے جہاں کچھ عرصہ تک نظامت کے عہدہ پر فائز رہے ان کی یہ مثنوی سفر حیدرآباد اور حیدرآباد کے حالات پر مشتمل ہے۔ اسے بھی ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے . . . . . . . . . . . (زیرِ طبع)

۹ - کلیاتِ شاہی - عادل شاہی حکمران، ملک الشعراء نصرتی کے سرپرست علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی کے کلیات کو بسیط عالمانہ مقدمہ کے ساتھ عبدالقادر سروری نے مرتب کیا ہے۔ (زیرِ طبع)

۱۰ - اردو نثر کا ارتقاء (اٹھارویں صدی عیسوی سے پہلے) عام طور پر یہ تصور کیا جاتا تھا کہ اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوئی۔ محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے قدیم نثری کارناموں کی تلاش اور تحقیق سے، فورٹ ولیم کالج سے قبل کے

اردو نثری کارناموں کے متعلق مستند مواد اس کتاب میں اکٹھا کر دیا ہے
تاریخ ادب اردو میں یہ ایک اہم اضافہ ہے۔ (زیر طبع)

۱۱۔ **حلقۂ زنار**۔ اردو کے ہندو ادیبوں اور شاعروں پر اس سے پہلے چند کارنامے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے ایک خاص پہلو سے مرتب کی ہے۔ اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ ہر شعبۂ ادب میں ہندو ادیبوں اور شاعروں کے کارنامے عہد آفریں اہمیت کے حامل ہیں۔ (زیر طبع)

۱۲۔ **دیوان احسان**۔ شاہ عالم ثانی کے استاد حافظ عبد الرحمٰن خاں احسان کے کلام کا مجموعہ جسے احسان کے شاگرد اور شاہ عالم کے فرزند، مرزا معز الدین ثابت نے جمع کیا تھا۔ اس پر جو مقدمہ ثابت نے لکھا ہے اس سے شاہ عالم کی ادبی دلچسپیوں کے بارے میں بڑی اہم معلومات ہوتی ہیں۔ محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس دیوان کو اپنے مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ (زیر طبع)

۱۳۔ **اردو میں نفسیاتی ناول**۔ جدید دور میں ناول اور اس کے فن کو بہت ترقی ہوئی، اور نفسیاتی ناول اردو ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں جناب یوسف سرمست صاحب ام۔ اے، لکچرار اردو، بدرکا ایوننگ کالج نے، ناول کی اس خاص صنف کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مواد اس کتاب میں اکٹھا کیا ہے۔ (زیر ترتیب)

۱۴۔ **توضیحی فہرست اردو مخطوطات**۔ (کتب خانہ مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن)
مجلس تحقیقات کے کتب خانے کے مخزوں تقریباً پانچسو مخطوطات کی توضیحی فہرست جس میں کئی کمیاب اور نایاب مخطوطات شامل ہیں۔ ایک رسالہ پر غالب حالی، نیر کی تحریریں ہیں اور لالہ لچھمی نارائن شفیق کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دس زبانوں کی لغت کے اجزاء، ایک کتاب پر مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حاشیے بھی ہیں .......... (زیر ترتیب)

---

مجلس تحقیقات اردو۔ ۶۸۸۔ ۶۔ ۳۔ جمایت نگر حیدرآباد دکن۔

Text Book

# Mathnavi-e-Lutf

## (Nairang-e-Ishq)

of

## MIRZA ALI LUTF

By

**Dr. Sameena Shaukat,**
M. A., Ph. D.

*Lecturer in Urdu,*
*University College for Women*
*Osmania University*
*Hyderabad-Dn.*

Published by

**Majlis-e-Tahqiqat-e-Urdu,**

HYDERABAD-DN.

1962